اگست ۱۹۹۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

پاکستان کے موجودہ حالات کا ماضی کے دو بحرانی ادوار سے تقابل

ملکی سیاسی صورت حال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا ایک فکر انگیز خطاب

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

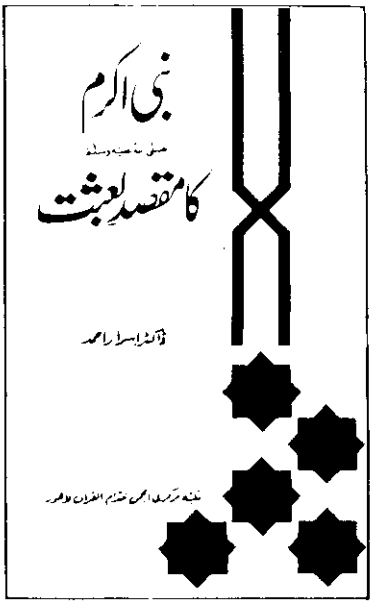

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۱۰ روپے

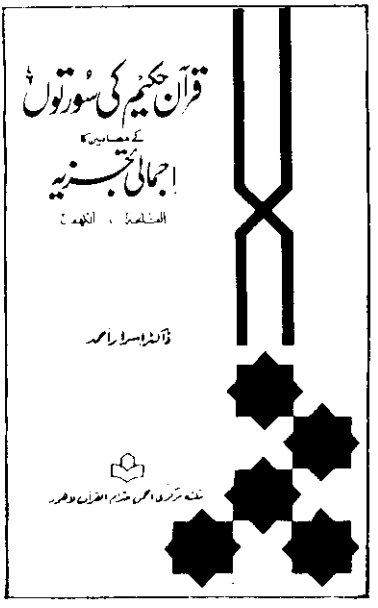

اشاعتِ خاص -۴۵ روپے، عام -۲۵ روپے

اشاعتِ خاص -/۱۶ روپے، عام -/۱۰ روپے

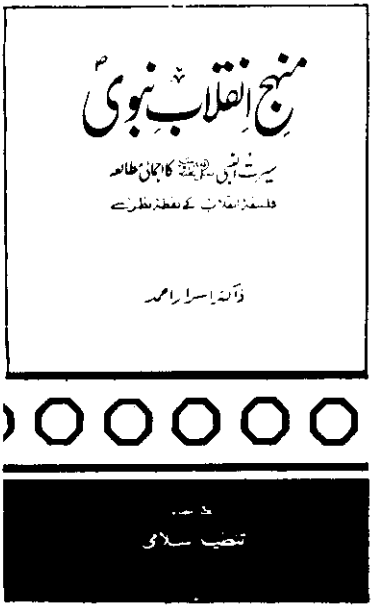

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۸
ربیع الاوّل ۱۴۱۷ھ
اگست ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اداریہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ____ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ____ ۵

پاکستان کے موجودہ حالات کا ماضی کے دو بحرانی ادوار سے تقابل

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ دعوت و تحریک ____ ۳۸

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ

انجینئر نوید احمد

☆ بحث و نظر ____ ۴۷

مسئلہ اجتہاد کے ضمن میں علامہ اقبال کی ایک اہم غلط فہمی

خالد محمود خضر

☆ کتابیات ____ ۶۵

نفاق کی نشانیاں (۵)

مترجم : شبیر بن نور

☆ گوشہ خواتین ____ ۷۳

تہذیب الاطفال (۳)

بیگم ڈاکٹر عبد الخالق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

زیر نظر شمارے کا نمایاں ترین اور بہت سے اعتبارات سے اہم ترین مضمون تو وہی ہے جس کا حوالہ سرورق پر مذکور ہے یعنی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ۵ رجولائی کا خطاب جمعہ جس میں انہوں نے ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال بلکہ بحرانی کیفیت کا موازنہ ماضی کے دو بحرانی ادوار سے کیا ہے اور اس کی تمہید کے طور پر ملک کی سیاسی تاریخ اور اس میں اتار چڑھاؤ کے مختلف ادوار کا بھرپور جائزہ بھی نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ کے دوران ماہنامہ "میثاق" میں امیر تنظیم کے ۷۹ء سے ۷۲ء کے عرصے میں ضبط تحریر میں آنے والے پر مغز سیاسی تجزیے بالاقساط شائع کیے گئے۔ ان مضامین کی مکرر اشاعت کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ملکی سیاسی امور میں رفقاء و احباب کی ذہنی تربیت کا سامان فراہم ہوا۔

ہم مسلمانان پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہماری ایک عظیم اکثریت اپنے ذاتی مسائل اور کسب معاش کی مصروفیت میں اس درجے منہمک ہے کہ اسے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں کہ ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں' ہم بحیثیت قوم کس رخ پر بڑھ رہے ہیں' ہماری پیش قدمی اپنے اصل ہدف یعنی قیام نظام اسلام کی جانب ہو رہی ہے یا ہم سیکولرزم کی راہ پر گامزن ہو کر بتدریج اپنے ہدف سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں' امت مسلمہ میں ہمارا کیا مقام ہے اور بین الاقوامی سطح پر ہم آج کس مقام پر کھڑے ہیں' وغیرہ!---ایک غم روزگار نے ہمیں ہر دوسرے غم سے بیگانہ کیا ہوا ہے۔ ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ تو یہی ہے' باقی رہ جانے والی ایک مختصر اقلیت جو ان معاملات کا کچھ شعور رکھتی ہے اس میں شامل اکثر افراد کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ان کی سوچ کا دائرہ بہت تنگ اور مشاہدہ نہایت سطحی ہے۔ یہ لوگ بالعموم گروہی تعصبات میں مبتلا ہونے کے باعث ملکی و قومی اور سیاسی حالات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ دین کے وسیع تر تصور سے ناآشنا ہونے کے سبب یہ لوگ میدان سیاست میں برسرکار سیکولر قوتوں میں سے کسی ایک کو حق کا علمبردار اور دوسرے کو باطل کا نمائندہ گردانتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مابین ہونے والی انتخابی کشمکش کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دے کر معاشرے میں ایک مصنوعی فضا پیدا کر دی جاتی ہے' جسے حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ملک میں موجود مختلف دینی و مذہبی سیاسی جماعتوں سے متعلق افراد کی اکثریت بھی بدقسمتی سے اسی سوچ کے حامل اشخاص پر مشتمل ہے۔

ان حالات میں اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانان پاکستان کی بالعموم اور رفقاء و احباب کی بالخصوص ذہنی تربیت کا سامان کیا جائے' ملکی سیاسی معاملات میں ان کی سوچ کو صحیح خطوط پر استوار کیا جائے اور ان کے اندر قومی و ملی معاملات کا شعور پیدا کیا جائے۔ بحمد اللہ ان مقاصد کے حصول میں یہ مضامین بہت ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ بہت سے رفقاء و احباب نے ان مضامین

کی اشاعت پر خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی افادیت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

پچیس تیس سال پرانے ان مضامین کی اشاعت کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوا کہ ملکی و قومی معاملات اور سیاسی امور میں امیر تنظیم اسلامی کی بالغ نظری' اصابت رائے' غیر جانبدارانہ سوچ اور بے لاگ تجزیہ نگاری کا وصف بھی کھل کر قارئین کے سامنے آیا ہے۔ چنانچہ بعض سنجیدہ اور اصابت فکر کے حامل احباب نے ان مضامین کو پڑھ کر ان کی افادیت کے پیش نظر امیر تنظیم سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ وہ سیاسی تجزیہ نگاری کا کام نہ صرف یہ کہ آئندہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھیں بلکہ ہر دو سرے کام پر اسے ترجیح دیں۔ ان کی رائے میں ان امور میں رفقاء و احباب ہی کی نہیں مسلمانان پاکستان کی بھی ذہنی و فکری تربیت وقت کا نہایت اہم تقاضا ہے۔ ہمیں یہاں اس رائے کے حق میں یا اس کے خلاف کچھ عرض نہیں کرنا' بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مضامین کے بارے میں احباب کے تاثرات قارئین تک پہنچا دیئے جائیں۔

زیر نظر شمارے میں شامل امیر تنظیم کے خطاب کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جائے۔ اس خطاب کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ملکی سیاسی تاریخ کے فکر انگیز تجزیئے اور ملک کی موجود الوقت سیاسی صورتحال کے ماضی کے دو سیاسی بحرانوں کے ساتھ تقابل پر مشتمل ہے۔ خطاب کا یہ حصہ ایسے ٹھوس حقائق و واقعات پر مشتمل ہے کہ اس کے مندرجات سے اختلاف کی گنجائش بہت ہی کم ہے' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ملکی و قومی امور میں عوام کی ذہنی و فکری تربیت کے نقطہ نگاہ سے یہ بہت قیمتی حصہ ہے' تو یہ بات ہرگز غلط نہ ہوگی۔ تاہم دوسرا حصہ جو قاضی حسین احمد صاحب کی حالیہ احتجاجی تحریک جسے خود قاضی صاحب نے "دھرنا" کا عنوان دیا' سے بحث کرتا ہے' چونکہ ایک ایسے معاملے سے متعلق ہے جو زمانہ حال سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا تسلسل ابھی جاری ہے لہٰذا اس کے بارے میں کہنے سننے اور اختلاف رائے کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ واقعات جو ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں ان کے عواقب و نتائج سامنے آنے کے بعد ان کے بارے میں رائے زنی آسان ہوتی ہے لیکن کرنٹ واقعات کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ محترم قاضی صاحب کی اس "دھرنا" تحریک کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی نے اپنی دیانتدارانہ رائے اور بے لاگ تجزیہ اس خطاب میں صاف لفظوں میں سامنے رکھ دیا ہے۔ امیر تنظیم کی اصابت رائے اور معاملات کے تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا ایک زمانہ معترف ہے تاہم یہ کوئی وحی آسمانی نہیں ہے' ایک انسانی کاوش ہے جس میں خطا کا احتمال بہرطور موجود ہوتا ہے' چنانچہ اس سے اختلاف کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ ان معاملات میں وقت سب سے بڑا قاضی ہے۔ آنے والا وقت بتا دے گا کہ امیر تنظیم کا یہ تجزیہ درست تھا یا اس سے اختلاف رکھنے والوں کی رائے مبنی بر صواب تھی!OO

پاکستان کے موجودہ حالات کا ماضی کے دو بحرانی ادوار سے تقابل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۵/ جولائی کا خطاب جمعہ

O

خطبہ مسنونہ' سورۃ الروم کی آیات ۴۱ تا ۴۵ کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

جیسا کہ آپ حضرات نے اخباری اعلان میں دیکھ لیا ہو گا' آج میری پوری گفتگو بنیادی طور پر ملکی و قومی حالات اور ضمنی طور پر بھارت اور افغانستان کے حالات کے بارے میں ہو گی۔ اگرچہ بین الاقوامی معاملات کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے' لیکن بھارت اور افغانستان ہمارے سب سے قریبی پڑوسی ہیں جن کے ساتھ ہماری سب سے طویل سرحدیں ہیں' لہٰذا ان کا معاملہ ہمارے لئے اہم تر ہے۔

ملکی و قومی حالات پر میری آج کی گفتگو کا ایک خاص سبب تو یہ ہے کہ ملک کی ایک اہم نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعت' جماعت اسلامی نے اچانک ایک ایجی ٹیشن کا آغاز کیا ہے۔ چونکہ ہم خود اسلامی انقلاب کا جو لائحہ عمل بیان کرتے ہیں اس کا آخری مرحلہ بھی ایجی ٹیشن ہے' لہٰذا بہت سے حضرات کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ شاید جماعت اسلامی کا موجودہ ایجی ٹیشن اسی طریقہ کار کا مظہر ہے۔ لیکن میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ ع آئیں وہ یاں خدا کرے' پر نہ خدا کرے کہ یوں! درحقیقت یہ ایجی ٹیشن کسی اور نوعیت کا ہے اور جس ایجی ٹیشن کا ہم نے نقشہ پیش کیا ہے وہ بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔ اس ضمن میں مغالطے پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

اس کا دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ اِس وقت سب دیکھ رہے ہیں کہ ملک پھر ایک سیاسی بحران کے بھنور میں پھنس رہا ہے۔ اس بارے میں بے نظیر صاحبہ نے تو یہ کہا ہے کہ موجودہ حالات ۷۷ء کے حالات کے مشابہ ہیں اور ایک نیا ضیاء الحق پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ ۷۷ء کے حالات اور موجودہ حالات میں بہت سے معاملات مشترک ہیں' مثلاً وہ ایجی ٹیشن ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تھا اور یہ ایجی ٹیشن بے نظیر بھٹو کے خلاف ہے اور باپ بیٹی کا رشتہ دونوں کے مابین قدر مشترک ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت سے گنوائی جاسکتی ہیں۔ لیکن میرے اپنے تجزیئے میں یہ حالات ۶۹ تا ۷۱ء کا جو ایک بحرانی دور گزرا ہے اس سے زیادہ مشابہ ہیں۔ میں جب ان حالات کا تذکرہ کرتا ہوں تو ہمارے بعض نوجوان ان کا صحیح طور سے اندازہ نہیں کرپاتے۔ ابھی حال ہی میں روزنامہ وفاق کی طرف سے ایک نوجوان صحافی انٹرویو لینے کے لئے آئے' وہ بھی ان حالات سے اتنے ناواقف تھے کہ کہنے لگے کہ میری تو عمر اس وقت تین برس کی تھی جب سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہوا ہے۔ جبکہ ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے' کیونکہ یہ حالات ہماری نگاہوں سے گزرے ہیں' بلکہ ہم ان حالات میں سے ہو کر گزرے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت کی نوجوان نسل ان حالات سے سرے سے واقف نہیں ہے۔ وہ کیا حالات تھے؟ ع یہی عالم تھا جس عالم میں دنیا لٹ گئی اپنی! اُس وقت ملک دولخت ہوا تھا اور تاریخ کی عظیم ترین ہزیمتوں اور شرمناک ترین شکستوں میں سے ایک ہمارا مقدر بنی تھی۔ ہمارے ۹۳ ہزار جنگی قیدی (P.O.W) جن میں سے ۴۳ ہزار ریگولر فورسز کے لوگ تھے' اس ہندو کے قبضے میں گئے جس پر ہم نے کہیں ہزار سال تک حکومت کی تھی' کہیں آٹھ سو اور کہیں چھ سو برس تک۔ یہ حادثہ تاریخ کے المناک ترین حوادث میں سے ایک تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس صدی میں یا تو سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ امّتِ مسلمہ کے لئے ایک عظیم حادثہ تھا جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا' اور یا پھر یہ جو دو حوادث ہوئے کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شرمناک شکست' اور ۱۹۷۱ء کا سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ۔ یوں سمجھئے کہ اس صدی میں امّتِ مسلمہ کی پیشانی پر یہ تین بہت بڑے داغ لگے ہیں۔

پاکستان کا چار سو سالہ پس منظر

آج کے حالات میں مجھے چونکہ اُس وقت کے حالات سے مشابہت نظر آ رہی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ؎

آگ ہے ' اولادِ ابراہیم ہے ' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

لہٰذا میں ان حالات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔ اور اس ضمن میں میری سوچ کا ایک خاص dimension بھی ہے۔ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ پاکستان کا قیام درحقیقت مشیتِ ایزدی کا ایک مظہر ہے۔ ایک اعتبار سے تو ہر معاملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی چیز واقع ہو گئی ہو وہ اذنِ رب کے بغیر تو نہیں ہوئی' اس لئے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے' وہ قادرِ مطلق ہے' اس کی اجازت کے بغیر تو پتّا بھی نہیں ہلتا۔ لیکن میں اس اِذن سے آگے بڑھ کر کہہ رہا ہوں کہ پاکستان مشیتِ ایزدی کا ایک خاص مظہر ہے۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام احیائے اسلام اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی الٰہی تدبیر کی ایک اہم کڑی ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر بڑی طویل ہوتی ہے۔ ہمارے منصوبے بنتے ہیں تو وہ پانچ سالہ یا سات سالہ منصوبے ہوتے ہیں' لیکن اللہ کا منصوبہ ہزار برس کا ہوتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی : "اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (الحج : ۴۷) "تمہارے رب کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ اسی طرح سورۂ سجدہ میں فرمایا : "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (آیت ۵) "وہ آسمان سے زمین تک (دنیا کے) معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے' ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے"۔ اس حوالے سے اللہ کی تدبیر بڑی طویل ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے پاکستان کا کم از کم چار سو برس کا پس منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ علمی اور روحانی اعتبار سے امّتِ مسلمہ کا جو مرکزِ ثقل (Centre of Gravity) تھا وہ چار سو برس پہلے برِّعظیم پاک و ہند میں منتقل ہو گیا۔

اس سے پہلے ایک ہزار برس تک تمام مجدّدینِ امت عالمِ عرب میں پیدا ہوئے' لیکن امتِ مسلمہ کی تاریخ کے پہلے ہزار برس مکمل ہونے کے بعد تمام مجددین امت اس صنم خانہ ہند میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ الفِ ثانی کے مجدّدِ اعظم' مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ' شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور سید احمد بریلویؒ سب یہیں پیدا ہوئے۔ پھر گزشتہ صدی ہجری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن' علامہ اقبال' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا الیاس (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں اس سرزمین میں پیدا ہوئیں' جن کے پائے کی کوئی شخصیت پورے عالم اسلام میں کہیں اور پیدا نہیں ہوئی۔

قیامِ پاکستان اور سُنّت اللہ

پاکستان کے قیام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اصول کی بنیاد پر ہوا تھا کہ جب کوئی قوم اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کرے کہ "اے اللہ تُو یہ کر دے تو ہم یہ کریں گے" تو اللہ تعالیٰ اس قوم کی دعا قبول کر کے اسے امتحان سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں بسنے والی پوری مسلمان قوم نے اللہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اے اللہ تو ہمیں ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی سے نجات دے دے اور ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما دے تو ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک آزاد ملک عطا فرما دیا۔ اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح نے' جو واقعتاً تحریکِ پاکستان کے فعّال قائد تھے' قیام پاکستان سے ایک سال پہلے آزاد پاکستان کے مطالبے سے دست برداری اختیار کر لی تھی اور کیبنٹ مشن پلان تسلیم کر لیا تھا' جس کے تحت ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے تحت آزاد ہوتا' جو تین زون (Zones) پر مشتمل ہوتا' مشرقی زون اور مغربی زون میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور سنٹرل زون میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی۔ مستقبل کے لئے اس پلان میں یہ طے کیا گیا تھا کہ دس سال بعد ان میں سے کوئی زون علیحدہ ہونا چاہے تو اسے اختیار ہو گا۔ گویا کہ ایک علیحدہ ملک کا امکان دس سال کے لئے تو بہرحال مؤخر ہو رہا تھا اور قائداعظم نے اسے تسلیم کر لیا تھا' لیکن اللہ نے فرمایا کہ نہیں' ابھی لو' آزاد اور خود

مختار پاکستان لو! جب تم نے کہا ہے کہ ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے تو ہم تم پر حجت قائم کر رہے ہیں' فَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ پھر ہم دیکھیں گے کہ تم کرتے کیا ہو! ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرتے ہو یا وعدہ خلافی کرتے ہو! لیکن ہم نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بجائے ان منافقین کا سا طرز عمل اختیار کیا جن کا ذکر سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵' ۷۶' ۷۷ میں وارد ہوا ہے۔ میں یہ آیات بارہا بیان کر چکا ہوں' تذکیر و یاددہانی کے لئے ان کا پھر مطالعہ کر لیجئے :

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾

"اور ان (منافقین) میں ایک خاص قسم ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا (دولت مند بنا دے گا) تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے"۔

﴿ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ﴾

"پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو اب وہ اس دولت کے ساتھ بخل کا معاملہ کرنے لگے' انہوں نے پیٹھ موڑلی اور اعراض کرنے لگے"۔

یعنی انہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ بھلا دیا اور اپنی تجوریوں کو تالے لگا دیئے۔ ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ کیا نکلا؟

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ ﴾

"چنانچہ اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری پیدا کر دی اس دن تک جب وہ اس سے ملاقات کریں گے' اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے"۔

یہی معاملہ اس پاکستانی قوم کے ساتھ پیش آیا کہ اس کی وعدہ خلافی کی وجہ سے اس پر نفاق کی بیماری مسلط کر دی گئی۔ چنانچہ ایک طرف یہ نفاقِ باہمی کا شکار ہو گئی اور قوم قومیتوں میں تحلیل ہو گئی۔ اب نئی نئی قومیتیں ہیں۔ فرض کیجئے پہلے پانچ قومیتیں تھیں' تو

اب ان میں بہت سی قومیتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے بنگلہ قومیت' پنجابی قومیت' سندھی قومیت' بلوچی قومیت اور پٹھان قومیت ہوا کرتی تھیں' لیکن اب ان کے علاوہ مہاجر قومیت' سرائیکی قومیت اور نامعلوم کتنی قومیتیں ہیں۔ ہر قومیت کئی مزید قومیتوں میں بٹ چکی ہے۔ پھر یہ کہ مذہبی اختلافات فرقہ واریت کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان کی بنیاد پر باہمی خون ریزی شروع ہو چکی ہے۔ یہ سارے نفاقِ باہمی کے مظاہر ہیں۔ دوسری طرف یہ قوم نفاقِ عملی کا شکار ہو گئی۔ حدیث میں آتا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں' چاہے وہ نماز پڑھتا ہو' روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو بڑا مسلمان سمجھتا ہو' لیکن اگر اس میں یہ تین خصلتیں موجود ہیں تو وہ کٹر منافق ہیں۔ وہ تین چیزیں حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہیں: "اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ' وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ' وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ" (متفق علیہ) یعنی "جب بات کرے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور کہیں امین بنا دیا جائے (چاہے اختیارات کی امانت ہو یا مال کی امانت) تو خیانت کرے"۔ نفاق عملی کی یہ تینوں نشانیاں ہماری پاکستانی قوم میں بحیثیت مجموعی بتمام و کمال موجود ہیں۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے کو فراموش کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا ایک کوڑا سوا پچیس برس انتظار کرنے کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں ہماری پیٹھ پر برسا۔ قیام پاکستان (اگست ۴۷ء) سے سقوطِ مشرقی پاکستان (دسمبر ۷۱ء) تک شمسی حساب سے اگرچہ سوا چوبیس برس بنتے ہیں لیکن قمری حساب سے یہ سوا پچیس برس ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر میں بار بار کہتا ہوں کہ اب شاید پھر وہی وقت آ رہا ہے' اگلے سوا پچیس برس اب پھر پورے ہو رہے ہیں۔ تو میری سوچ کے اندر چونکہ یہ dimensions بھی ہیں تو مجھے تو بار بار خیال آتا ہے کہ ؎

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شامتِ اعمال پھر کسی عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والی ہے۔ اس اعتبار سے مجھے یہ حالات ۶۹ء سے ۷۱ء تک کے حالات سے زیادہ مشابہ نظر آ رہے ہیں اور اسی کا آج مجھے تجزیہ پیش کرنا ہے۔

پاکستان سے وابستہ امیدیں اور آرزوئیں

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ملکی سیاست سے مجھے اس اعتبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ گاؤ آمد و خر رفت یا خر آمد و گاؤ رفت۔ میرے نزدیک موجودہ نظام کی موجودگی میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہو یا مسلم لیگ کی حکومت' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چہرے بدلتے ہیں' تھوڑا تھوڑا سا انداز بدلتا ہے' اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہی سودی نظام' وہی جاگیردارانہ نظام' وہی امریکہ کے گھڑے کی مچھلی اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی اسامی بن کر رہ جانا' یہ ساری پالیسیاں مشترک ہیں' ان میں سرِمو کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا سیاسی حالات میں میری دلچسپی اس معنی میں نہیں ہے' بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن ابھی تک یہاں اس کے قیام کے مقصد کی طرف کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔

مسلمان زعماء میں سے مولانا ابوالکلام آزاد قیام پاکستان کے شدید ترین مخالف تھے' لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ جب تک پاکستان بنا نہیں تھا مسئلہ اور تھا' مگر اب اسلام کی عزت پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک اہم سیاسی راہنما تقسیم ہند کے وقت پاکستان آ گئے تھے۔ ابتداء میں آمد و رفت کی زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ یہ دوبارہ انڈیا گئے اور وہاں پر نہرو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کیوں چلے گئے ہیں؟ آپ واپس آ جایئے' ہم آپ کو کسی مسلمان ملک میں سفیر بنا کر بھیجتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی اس پر کچھ آمادگی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے۔ مولانا آزاد نے جب ان سے نہرو سے ملاقات کے بارے میں پوچھا اور انہوں نے ان کی پیشکش کے بارے میں بتایا تو مولانا آزاد نے کہا: "نہیں میرے بھائی! اب تم پاکستان کو مستحکم کرو۔ اب جا کر اپنی صلاحیتیں اور قوتیں وہاں لگاؤ۔ اب اس کے ساتھ اسلام کی عزت وابستہ ہو گئی ہے"۔ اسی طرح کا واقعہ مولانا محمد مالک کاندھلوی" شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ' نے ہماری قرآن کانفرنس میں سنایا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا حسین احمد مدنی" ڈابھیل گئے ہوئے تھے' وہاں پر ایک نشست ہو رہی تھی' کسی

شریر نے ایسے ہی پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا کہ دیکھیں اب شاید مولانا مدنی کی طرف سے بڑے غیظ و غضب کا اظہار ہو۔ لیکن اس پر مولانا کی طرف سے عجیب تاثرات کا اظہار ہوا۔ مولانا نے فرمایا کہ دیکھو بھائی' جب تک مسجد بن نہیں جاتی' اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے کہ یہاں مسجد بنانی چاہئے یا نہیں۔ پھر یہ کہ کتنی لمبی چوڑی بنانی چاہئے' اس کا کیا نقشہ ہونا چاہئے' اس کے اندر کیا میٹریل لگنا چاہئے' سب میں اختلافات کی گنجائش ہے' لیکن جب مسجد بن جائے تو اب اس کا اینٹ گارا محض اینٹ گارا نہیں رہا' اب وہ مسجد کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ اب اس کی حفاظت ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔

یہ مملکتِ خداداد جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی اس سے کیسے کیسے لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں' لیکن اب اس خیال سے دل کانپتا ہے کہ کہیں ایک کے بعد اب عذابِ الٰہی کا دوسرا کوڑا بھی برسنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں جلّاد اپنا ہاتھ اونچا نہ کر چکا ہو۔ لیکن پھر بھی ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

بہرحال ایک امید ابھی باقی ہے' ٹمٹماتی ہوئی امید' جو کبھی حوصلہ دیتی ہے' پھر دھندلا جاتی ہے' اس کی روشنی کبھی تھوڑی سی بڑھتی ہے' پھر اس کے اوپر مایوسی کے اندھیارے طاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ چمک اٹھتی ہے۔ ایک طبیب کے الفاظ میں اس کے بارے میں کہا جائے گا "جب تک سانس تب تک آس"۔ جب تک یہ ملک باقی ہے' کوئی نہ کوئی توقع ہے' بالفاظ قرآنی لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ شاید کہ یہ لوٹ آئیں' اور لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ کیا عجب کہ تقویٰ کی روش اختیار کر لیں!

اب آیئے' اِس وقت کے حالات کیا ہیں؟ ان کا کیا پس منظر ہے؟ آیا یہ ۷۷ء کے حالات سے مشابہ ہیں یا ۶۹ تا ۷۱ء کے حالات سے مشابہ ہیں؟ اس کے لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے پاکستان کے ابتدائی بائیس برس کو گیارہ گیارہ برس کے دو ادوار (۴۷ء تا ۵۸ء اور ۵۸ء تا ۷۱ء) کے حوالے سے سمجھ لیجئے۔

پاکستان کے ابتدائی گیارہ سال

قیام پاکستان کے بعد پہلے گیارہ برس (۴۷ء تا ۵۸ء) کے دوران تین کام ہوئے۔ سب سے پہلے یہ کہ مسلم لیگ، جو بانی پاکستان مسلم لیگ تھی، تین برس کے اندر اندر تحلیل ہو گئی۔ نام کی مسلم لیگیں تو اب بھی ہیں، لیکن اصل مسلم لیگ باقی نہ رہی۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ سا یاد آگیا ہے۔ جب مولانا مودودی پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے تو ان پر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ زیر سماعت تھا اور ججوں میں ایک صاحب ایس اے رحمان خان صاحب بھی تھے۔ جب نعیم صدیقی صاحب کو معلوم ہوا کہ کیس کی سماعت ایس اے رحمان صاحب کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا: ایسے (ایس اے) رحمان تو بہت سے ہیں، اصل فیصلے تو رحمان کی عدالت میں ہونے ہیں۔ اسی طرح میں عرض کر رہا ہوں کہ نام کی مسلم لیگیں تو بعد میں بہت ہوئیں جو یوں سمجھئے کہ اب تاریخ کے عجائب گھر کی زینت ہیں، اور ان کے تو نام بھی اب بہت سے لوگوں کے ذہنوں سے نکل گئے ہوں گے۔ اب بہت کم لوگوں کو یہ یاد رہ گیا ہو گا کہ کبھی مسلم لیگ کے لیبل کے ساتھ کوئی کنونشن مسلم لیگ بھی تھی، کوئی کونسل مسلم لیگ بھی تھی، کوئی قیوم لیگ ہوتی تھی، کوئی جناح لیگ ہوتی تھی، کوئی عوامی مسلم لیگ ہوتی تھی، جو پھر جناح عوامی مسلم لیگ بن گئی تھی، پھر قاسم لیگ تھی، مشرقی پاکستان کے فضل القادر چودھری کی بھی ایک مسلم لیگ تھی۔ کتنی لیگیں آپ گنیں گے۔ پھر یہ کہ اب جونیجو لیگ ہے، نواز شریف لیگ ہے۔ تو ایسی لیگیں تو بہت ہیں، لیکن وہ مسلم لیگ جو بانیٔ پاکستان تھی وہ قیام پاکستان کے تین برس کے اندر اندر ہی تحلیل ہو گئی تھی۔

دوسرے مرحلے میں اس ملک کے اندر مقامی جاگیرداروں اور وڈیروں پر مشتمل اشرافیہ (Landed Aristocracy) نے جنم لیا۔ قائد اعظم تو بمبئی سے آئے تھے، حسین امام بہار سے آئے تھے، لیاقت علی خان یوپی سے آئے تھے، خلیق الزمان لکھنؤ سے آئے تھے، اسی طرح کوئی مدراس سے اور کوئی چندی گڑھ (سی پی) سے چل کر آیا تھا۔ اصل مسلم لیگی راہنما تو یہ تھے، لیکن ان حضرات کے منظر سے ہٹنے کے بعد مسلم لیگ یہاں کے وڈیروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی مسلم لیگ ہو گئی۔ چنانچہ لینڈڈ اَرِسٹوکریسی کا دور آیا جو اس ملک میں شدید بدنظمی اور انتشار (Chaos) کا دور تھا۔ پھر سول بیورو

کریسی نے بھی رفتہ رفتہ ملک و قوم کی قسمت سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ہماری سول بیورو کریسی میں اگرچہ ہر طرح کے لوگ تھے' ان میں وہ بھی تھے جو پاکستان کے بہت مخلص تھے' لیکن وہ بھی تھے جو موقع پرست تھے۔ ان ہی میں سے ملک غلام محمد صاحب نکل کر آگئے۔ ویسے تو زاہد حسین صاحب بھی بیورو کریسی سے آئے تھے لیکن وہ سیاست میں کبھی نہیں آئے' صرف سٹیٹ بینک کے گورنر ہی رہے۔ چوہدری محمد علی صاحب اور پھر سکندر مرزا صاحب بھی بیورو کریسی سے آئے تھے۔ یہ دوسرا دور تھا کہ جس میں کچھ ہماری لینڈڈ ارسٹوکریسی اور کچھ سول بیورو کریسی کے درمیان ایک ملی بھگت چل رہی تھی۔ تیسرے مرحلے پر آکر پھر سول بیورو کریسی بھی بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد پھر صدر ایوب خان صاحب کو اپنے جوہر آزمانے کا موقع ملا۔

لیاقت علی خان کے تین کارہائے نمایاں :

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک گیارہ برس تو اس میں گزر گئے جو میں نے تین مرحلے بیان کئے ہیں۔ بانی پاکستان قائداعظم تو جلد ہی رخصت ہو گئے تھے' ان کے بعد ان کے دست راست لیاقت علی خان میدان میں آئے۔ ان کی کمزوریاں اپنی جگہ پر تھیں' لیکن ان کے دور میں تین اہم کام ہوئے' جس کا بہت بڑا کریڈٹ انہیں جاتا ہے۔

اولاً : قرارداد مقاصد پاس ہو گئی۔ اگرچہ اس کے لئے مہم جماعت اسلامی نے چلائی' ہم نے بھی اس میں کام کیا' طالب علموں کی حیثیت سے بھاگ دوڑ کی' پھر مسلم لیگی حلقوں نے بھی اس کی حمایت کی' پھر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کے منظور کروانے میں اسمبلی کے اندر فیصلہ کن کردار ادا کیا' لیکن بہرحال یہ لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں منظور ہوئی اور اس کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ زمانے کے اعتبار سے تو یہ بہت بڑا جرم تھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہمارے ارکان اسمبلی تو اس پر شرم کے مارے زمین میں گڑے جا رہے تھے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ہم نے خدا کو سیاست اور ایوانِ ریاست سے نکال باہر کیا تھا' یہ پھر اسے لے کر آگئے ہیں؟ یہ عالمی سطح پر سیکولرزم کا دور ہے' اس دور میں تو خدا' God' اللہ یا رام کا مقام

مسجد' مندر' چرچ یا سینیگاگ ہے' یہ اسے وہاں سے نکال کر ایوان ریاست میں لا رہے ہیں؟

ثانیاً : دورِ حاضر کے اعتبار سے انہوں نے ایک بہت بڑی "غلطی" مزید کی' جسے عالمی استعمار پسند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ "پاکستان ڈے پریڈ" کے موقع پر چودہ مسلمان ممالک کے فوجی دستے لا کر کھڑے کر دیئے۔ گویا کہ پاکستان کے راستے سے اللہ بھی آ رہا ہے (Allah is staging a comeback through Paksitan) اور پین اسلام ازم بھی آ رہا ہے۔

تیسرا کام جو وہ کرنا چاہتے تھے' لیکن انہیں اس کا موقع نہیں مل سکا' وہ اس ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ ہے۔ میرے پاس اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں' حال ہی میں سید حسین نصر کے صاحبزادے ولی رازی کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لیاقت علی خان اس ملک سے جاگیرداری کے خاتمے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے' جس کی بعض مذہبی جماعتوں نے بھی مخالفت کی تھی۔ تاہم یہ اس حوالے سے تفصیل میں جانے کا محل نہیں ہے۔ قصہ مختصر لیاقت علی خان اپنے ان "ناقابلِ معافی جرائم" کی پاداش میں منظر سے ہٹا دیئے گئے۔ بہت بعد میں ایسے ہی "جرائم" کی پاداش میں شاہ فیصل کو شہید کر دیا گیا تھا اور ایسے ہی "جرائم" کی پاداش میں بھٹو کو منظر عام سے ہٹایا گیا۔

تحریکِ ختم نبوت اور اس کا نتیجہ :

ابتدائی گیارہ برسوں پر مشتمل یہ ہماری سیاسی تاریخ کا پہلا دور تھا۔ اس عرصے میں ملک کی سیاسی گاڑی کو پہلی بار دستور کی پٹڑی سے اتارنے میں بنیادی کردار مجلس احرار کی تحریک ختم نبوت (۱۹۵۳ء) نے ادا کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ختمِ نبوت کی تحریک اپنی جگہ پر ایک درست تحریک تھی' اور احرار کی نیک نیتی پر ہرگز کوئی حرف زنی نہیں کی جا سکتی' لیکن اس کے نتیجے میں بہرحال ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ ملکی سیاست کی گاڑی دستور کی پٹڑی سے اتر گئی۔ اُس وقت لینڈ ڈارسٹوکریسی کے ایک بڑے کھلاڑی ممتاز دولتانہ نے اس تحریک سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا رخ مرکز کی

طرف کر دیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب وزارت عظمیٰ سے محروم کر دیئے گئے اور بیوروکریسی نے آکر اپنے قدم جما لئے۔

ایوب خان کا گیارہ سالہ دورِ آمریت

ملکی سیاست کے دوسرے گیارہ سال ایوب خان کے دورِ اقتدار پر محیط ہیں۔ اس کے شروع کے ساڑھے تین سال مارشل لاء رہا' لیکن پھر ایوب خان نے اسے صدارتی نظام اور کنٹرولڈ ڈیموکریسی (یعنی ایسی محدود جمہوریت جو اپنے کنٹرول میں رہے) میں بدل کر ایک ظاہری ساسویلین فیس (Civilian Face) عطا کر دیا۔ وہ درحقیقت ایک آمرانہ نظام تھا' لیکن ایک دستور کا نقشہ بھی بہرحال موجود تھا۔ اسے آپ ایک دستوری آمریت کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جب صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح مقابلے پر آئیں تو ایوب خان کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ کیونکہ جہاں بھی دستور اور قانون و قاعدہ نام کی کوئی چیز ہو گی تو چاہے وہ آمریت کے ساتھ ہی ہو' پھر بھی بہت بڑے بڑے آمروں کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتی ہے۔

اس گیارہ سالہ دور کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں ملک میں بے پناہ صنعتی ترقی ہوئی۔ نیز سیاسی اکھیڑ پچھاڑ اور اختلال (Chaos) کی وہ صورتحال بھی ختم ہو گئی کہ جس کے بارے میں نہرو صاحب نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ میں ہفتے بھر میں کپڑوں کے اتنے جوڑے نہیں بدلتا جتنی وہاں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ جب ان سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کی حکومت سے گفتگو کرو تو انہوں نے کہا تھا کہ میں کس سے گفتگو کروں' آج وہاں ایک کی حکومت ہے' کل کسی اور کی' پرسوں کسی اور کی ہے۔ پتہ تو چلے کہ "Who is who there!" کس کے پاس کوئی اختیار ہے' کس کو کوئی مینڈیٹ حاصل ہے' کس کے ساتھ عوام ہیں۔ بہرحال سیاسی انتشار کا وہ دور جب ختم ہوا تو یقیناً ایک استحکام پیدا ہوا' جس کا ایک معاشی فائدہ یہ ہوا کہ اس دور میں صنعتی ترقی ہوئی۔ لیکن اس کا جو منفی نتیجہ نکلنا تھا وہ بھی نکلا۔ یعنی مشرقی پاکستان میں شدید احساسِ محرومی نے جنم لیا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو کہتے ہیں کہ "پاکستان اسلام کے نام

پر' لیکن جمہوریت کے راستے سے بنا ہے"۔ واقعہ یہ ہے کہ ۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی فتح نے پاکستان بنوایا ہے' لوگوں نے مسلم لیگ کو اسلام کے نام پر ووٹ دیئے تھے۔ چنانچہ ایوب خان کے دور آمریت میں جب دار الخلافہ بھی کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا' تو مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اسی وقت کہنا شروع کر دیا تھا کہ "This is the beginning of the end"۔ کراچی ایک کاسمو پولیٹن شہر تھا' وہاں سے مشرقی پاکستان کا رابطہ سمندری راستے سے آسان تھا' ہوائی سفر تو اُس وقت تک بہت مہنگا تھا۔ لیکن دار الخلافہ وہاں سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ اس اقدام سے ایک طرف تو مہاجرین کی خوش فہمیاں دور ہونے لگیں اور ان پر عیاں ہو گیا کہ اب وہ یہاں پر تیسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔ کراچی کے دار الخلافہ ہوتے ہوئے انہیں کسی درجے میں اپنی اہمیت کا احساس تھا' لیکن اب وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئے۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کے لوگوں کی آنکھیں بھی کھلنے لگیں اور انہوں نے کچھ زیادہ ہی حقیقت پسندانہ انداز میں حساب کتاب شروع کر دیئے کہ غیر ملکی زر مبادلہ ہم زیادہ کماتے ہیں جبکہ یہ خرچ مغربی پاکستان پر ہوتا ہے۔ بجٹ میں ملکی دفاع اور مسلح افواج کے لئے جو رقم مختص کی جاتی وہ اسے بھی مغربی پاکستان بلکہ پنجاب کے کھاتے میں ڈالتے تھے' کیونکہ ان کے نزدیک فوج کا تعلق صرف پنجاب سے تھا۔ بہرحال ایسے عوامل کے نتیجے میں وہاں پر احساس محرومی پیدا ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے انتہائی خوفناک شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ پاکستان جمہوریت کے ذریعے وجود میں آیا تھا اور اسی جمہوریت کے ساتھ ہی یہ چل سکتا تھا۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے لوگ اس کے بغیر ساتھ دینے کو قطعاً تیار نہیں تھے۔ چنانچہ دورِ آمریت میں یہ احساس محرومی بڑھتے بڑھتے اپنی منطقی انتہا تک پہنچ گیا۔

اپنے گیارہ سالہ دور میں اقتدار پر ایوب خان کی گرفت خاصی مضبوط رہی' لیکن ۱۹۶۸ء سے کچھ اضطراب اور ہلچل کا آغاز ہوا۔ پہلے تو عید کے چاند پر جھگڑا ہو گیا تھا' جس پر علماء کی طرف سے کچھ ایجی ٹیشن ہوا۔ پھر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام" چھپ کر آ گئی' جس کے خلاف علماء اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا' اس

لئے کہ واقعتاً اس میں بعض چیزیں بہت ہی قابل اعتراض تھیں۔ اور چونکہ انہوں نے ایک سرکاری ادارے ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے سربراہ کی حیثیت سے وہ کتاب لکھی تھی اس لئے اس کتاب کے خلاف ایجی ٹیشن نے حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد پھر صدر ایوب کے قدم جم نہ سکے۔

یحییٰ خان کا تین سالہ دور

اس کے بعد ۶۹ء سے ۷۱ء تک یحییٰ خان کے جو تین سال ہیں ان کے لئے انگریزی کا ایک ہی لفظ "Chaos" بولا جاسکتا ہے' یعنی یہ شدید افراتفری' اختلال وانتشار اور بے یقینی کا دور تھا۔ اور کسی بھی استحکام کے دور کے بعد کوئی نیا دور شروع ہونے کے درمیان Chaos کا ایک عبوری دور آیا کرتا ہے۔ ۶۹ء سے ۷۱ء تک کے اسی ہنگامی دور میں "دنیا لٹ گئی اپنی" والی بات ہوئی اور وہ پاکستان ختم ہوگیا جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا' جو اپنے قیام کے وقت دو خطوں پر مشتمل تھا اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک تھا---- وہ پاکستان کہ جس سے بھارت کے مسلمانوں کی امیدیں بھی وابستہ تھیں اور جسے وہ اپنا سہارا اور محافظ سمجھتے تھے' قصۂ ماضی بن گیا۔ ۱۹۸۰ء میں میں پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو علی گڑھ کے مسلمانوں نے مجھ سے صاف کہا کہ ۷۱ء تک ہم یہ سمجھتے رہے کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے' لیکن اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کرلے تو بہت ہے' ہماری حفاظت کیا کرے گا۔ ہم تو اب یہیں پر رہیں گے' یہیں جئیں گے یہیں مریں گے' لیکن ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ مریں گے تو لڑ کر مریں گے' ہم بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے۔ بہرحال یہ ان کی عزیمت کا پہلو تھا' لیکن اِس وقت میری گفتگو سے متعلق بات یہ ہے کہ وہ پاکستان جو برِّعظیم پاک و ہند کے تمام مسلمانوں کی خوابوں اور امیدوں کی آماجگاہ تھا' ۷۱ء کے بعد وہ پاکستان نہیں رہا۔

ایوب خان کے زوال میں جماعت اسلامی کا کردار

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر ایوب کے اقتدار کو کھوکھلا کرنے میں سب سے بڑا

کی گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری خرابی کی جڑ اور بنیاد صدر ایوب ہیں، جس کا نقطہ عروج صدارتی انتخاب میں فاطمہ جناح اور ایوب خان کے مقابلے کے وقت مولانا مودودی کا وہ جملہ ہے کہ "ایک طرف ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے اور ایک طرف ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے"۔ جماعت اسلامی نے ملک کو ایوبی آمریت سے نجات دینے کے لئے دوسری سیاسی پارٹیوں سے مل کر بہت سے اتحاد بھی قائم کئے اور بحالی جمہوریت کی تحریک چلائی، لیکن اس ساری جدّوجہد کا حاصل کیا ہوا؟ کھیر کسی نے پکائی، اور کھا کوئی اور گیا۔ جماعت اسلامی نے ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے لئے جو شدید محنت اور بھاگ دوڑ کی، اس کے لئے دن رات ایک کر دیئے، اس کا فائدہ ایک نیا ابھرنے والا نوجوان ذوالفقار علی بھٹو لے گیا، جو ایوب خان کے زیر سرپرستی پروان چڑھا تھا اور اسے ڈیڈی کہا کرتا تھا۔ بہرحال اس تین سالہ دور کی تمام تر سیاسی شورش کا انجام امتِ مسلمہ کے لئے عظیم ترین سانحے یعنی پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا، اور اس کے بعد مغربی پاکستان یا بچے کھچے پاکستان پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہو گئی۔

پیپلز پارٹی کا پہلا پانچ سالہ دور

اس کے بعد چوتھا دور ۷۲ء سے ۷۷ء تک کے پانچ سال پر مشتمل ہے۔ یہ پیپلز پارٹی کا پہلا دور ہے، یعنی ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کا دور جو اسلامی سوشلزم کے نام پر برسرِ اقتدار آئی تھی، جس نے روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر ووٹ حاصل کئے تھے، جس نے مزدوروں اور کاشتکاروں کے حقوق کے نام پر عوامی حمایت حاصل کی تھی، جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کا اعلان کر کے آئی تھی۔ اب جبکہ بھٹو کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے ہیں، ہمیں اس کے دورِ حکومت کا دیانت داری سے تجزیہ کرنا چاہئے۔ بھٹو داخلی طور پر ناکام ترین حکمران ثابت ہوا، اگرچہ اس نے دو کارنامے واقعتاً ایسے کر دکھائے کہ ان کا کریڈٹ اس کو جاتا ہے۔ وہ اصلاً ایک "سیاسی حیوان" (Political Animal) تھا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ

"We are animals of the deserts" یعنی ہم تو صحراؤں کے حیوان ہیں۔ گویا جس طرح صحرا کے اونٹ یا دوسرے جانور مشقت برداشت کر سکتے ہیں' صحراؤں کی سختیاں جھیل سکتے ہیں' ہم اس طرح کے لوگ ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں سیاسی سوجھ بوجھ موجود تھی۔ اس کا مزاج سیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی بھی تھا۔

اس کا پہلا کارنامہ ۱۹۷۳ء کے دستور پر اتفاقِ رائے (consensus) حاصل کر لینا تھا' اگرچہ اس نے خود ہی اس میں ترمیمیں کر کے بہت جلد اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس طرح اس نے دستور کو موم کی ناک بنا کر رکھ دیا جسے وہ جدھر چاہتا مروڑ لیتا۔ اور ایک مرتبہ اسے مرضی کے مطابق مروڑنے کے لئے اسے بہت سے بزرگ اراکین کو اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کر کے اسمبلی سے باہر بھی پھینکوانا پڑا۔ یہ سب ساری باتیں یاد کر لیجئے' لیکن یہ سب اس کے بعد کی باتیں ہیں جب اس نے دستور بنوا لیا تھا اور سب سے اس پر دستخط لے لئے تھے۔ یہ یقیناً اس کا ایک اہم کارنامہ تھا۔

بھٹو کا دوسرا اہم کارنامہ قادیانی مسئلے کو حل کرنا تھا۔ اس مسئلے کو اس نے جس مدبرانہ انداز سے حل کیا وہ یقیناً قابل ستائش ہے' ورنہ اگر ۱۹۵۳ء کی طرح تشدد کی پالیسی اختیار کی جاتی تو اس کے نتائج ملک و قوم کے حق میں اچھے نہ نکلتے۔ میرے نزدیک اس کا کریڈٹ بھی اسے دیا جانا چاہئے۔

تیسری بات جس کا کریڈٹ میں اسے دیتا ہوں وہ اس کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ بدقسمتی سے وہ اس کے نتائج کو کنٹرول نہیں کر سکا اور اس سے بجائے خیر کے شر پیدا ہو گیا۔ میری مراد اس کے اس کارنامے سے ہے کہ اس نے ایک طرف مزدوروں اور کسانوں میں عزتِ نفس کا احساس بیدار کیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور یہ جاگیردار اور کارخانے دار بھی انسان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اس ملک کے اندر ایک بہت بڑا "Break through" تھا۔ اور دوسری طرف وہ ملک کی سیاست کو وڈیروں کے ڈرائنگ روموں سے نکال کر گلی کوچوں میں لے آیا۔ یہ بھی یقیناً اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا' جس سے سیاست میں عوامی دور کا آغاز ہوا۔ پاکستان کی سیاست یا تو شروع میں

قائداعظم اور لیاقت علی خان کے دور میں عوامی تھی' یا پھر اس کے بعد حقیقتاً عوامی ہوئی ہے ذوالفقار علی بھٹو کے دَور میں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' وہ ان دونوں چیزوں کے نتائج کو نہیں سنبھال سکا۔ سٹیم پیدا کرلینا یقیناً ایک کام ہے' لیکن اسے اس طرح سے استعمال کرنا کہ وہ انجن کے پسٹن (Piston) کو تو حرکت دے مگر کسی اور طرف سے لیک نہ ہو جائے' یا بوائلر میں اتنی سٹیم جمع نہ ہو جائے کہ بوائلر ہی پھٹ جائے' یہ سب کچھ اہم تر ہے۔ لیکن بھٹو نے سٹیم تو پیدا کر دی لیکن بوائلر کو نہ سنبھال سکا' جس کا منفی نتیجہ ایک طرف یہ نکلا کہ مزدور نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ گویا تُو بھی رانی میں بھی رانی' کون بھرے گا پانی؟ دوسری طرف سیاست' جس کی عصمت دری پہلے ڈرائنگ روموں میں ہوتی تھی اب سرعام غنڈوں کے ہاتھوں بے آبرو ہونے لگی' اس لئے کہ گلی میں غنڈے کا راج تھا۔ معاشرہ تو تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وڈیرے سیاستدانوں کے ڈرائنگ روموں اور سجے سجائے ایوانوں میں کوئی وضعداری تو تھی' کوئی رکھ رکھاؤ تو تھا' ان کی اپنی ایک تہذیب تو تھی' کچھ روایات تو تھیں' وہ جو بھی کرتے تھے وہاں اندر کرتے تھے لیکن اب وہ سب کچھ چوراہے میں غنڈوں کے ہاتھوں ہونے لگا۔ لہٰذا اندرونی طور پر تو واقعہ یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ناکام ترین حکمران ثابت ہوا۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ میرے پاس آدمی نہیں ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پانچ سو آدمی بھی میرے پاس نہیں ہیں۔ گویا جو بات قائد اعظم نے کہی تھی کہ میری جیب میں صرف کھوٹے سکے ہیں وہی بات ذوالفقار علی بھٹو کو کہنی پڑی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی خارجہ پالیسی

ذوالفقار علی بھٹو داخلی طور پر جتنا ناکام تھا' خارجی طور پر اور بین الاقوامی سطح پر وہ اتنا ہی کامیاب تھا۔ قبل ازیں وہ ایک کامیاب وزیر خارجہ بھی رہ چکا تھا اور وہ امریکیوں سے برابری کی سطح پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا' جو کسی اور کے بس کا روگ نہیں۔ وہ تیسری دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ عرب میں عالم اسلام کا ابھرتا ہوا ستارہ شاہ فیصل شہید تھے اور ان کا منظورِ نظر اور چہیتا شخص ذوالفقار علی بھٹو

تھا۔ ۱۹۷۴ء کی عالمی سربراہی کانفرنس کو یاد کیجئے جب دنیا کانپ اٹھی تھی کہ یہ کیا ہونے لگا ہے؟ عالمِ اسلام متحد ہو رہا ہے! پھر پین اسلام ازم کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے!! ہر ٹیکسی اور رکشا کے پیچھے لکھا ہوا تھا: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" (اللہ کی رسی کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لو!) اتحادِ اسلامی پر مشتمل بڑے بڑے بینرز لگے ہوئے تھے۔ غرضیکہ اس ملک کے اندر ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ پوری اسلامی دنیا کی سربراہی کانفرنس یہاں منعقد ہوئی، جس میں اہم فیصلے ہوئے۔ چنانچہ ایک طرف شاہ فیصل نے اسرائیل اور اس کے عالمی سرپرستوں کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا اور دوسری طرف بھٹو نے ایٹم بم بنانے کی دھمکی دے دی۔ ان دونوں کے یہ "جرائم" ناقابل معافی تھے۔ چنانچہ اُدھر شاہ فیصل کو ان کے سگے بھتیجے کے ہاتھوں شہید کرا دیا گیا، جو ایک یہودی لڑکی کے دام میں گرفتار تھا، جس کے ان دنوں اخبارات میں فوٹو بھی چھپے تھے، جس میں وہ اس کے کندھے پر سوار تھی۔ اور اِدھر بھٹو جس انجام کو پہنچا وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ اندرونی سطح پر اس سے یا اس کے جونیئرز سے ایک فاش غلطی ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں دھاندلی کی ہوئی، جس کی بنیاد پر اس کے خلاف ایک برجستہ تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، جس سے بیرونی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا۔ بیرونی حکومتیں تو اپنے داؤ پر ہوتی ہیں، وہ دیکھتی رہتی ہیں کہ ان ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ کونسا گھوڑا اس وقت تیز دوڑنے والا ہے کہ اس پر داؤ لگائیں اور اپنی قسمت آزمائیں اور کس کو کس کے ذریعے میدان سے ہٹائیں۔ پھر اس سے بعد میں نپٹ لیں گے۔

۱۹۷۷ء کے حالات کا ایک جائزہ

۱۹۷۷ء کے حالات کا مختصر تجزیہ میں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کہ آپ ان سے موجودہ حالات کا تقابل کر سکیں۔ چنانچہ اب ذرا جائزہ لے لیجئے کہ ہمارے ۱۹۷۷ء کے حالات میں تین باتیں نمایاں تھیں، جو اَب نہیں ہیں۔

اولاً: بھٹو کی حکومت بہت مستحکم تھی۔ ثانیاً: پاکستان قومی اتحاد (PNA) بھی نہایت منظم اتحاد تھا، جس میں نو جماعتیں یکمشت جمع تھیں۔ اس ملک کی تاریخ میں اتنے

بڑے اور اتنے کامیاب اتحاد کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی، جس میں تمام فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوتے تھے، جبکہ اس میں اس قدر مختلف نظریات کے حامل لوگ اکٹھے تھے۔ اس میں بائیں بازو کے خالص سیکولر لوگ بھی تھے، آزاد خیال (Liberals) بھی تھے اور راسخ العقیدہ قدامت پسند (Orthodox) اور بنیاد پرست (Fundamentalists) بھی تھے۔ آرتھوڈوکس میں بریلوی بھی تھے، دیوبندی بھی تھے اور اہلحدیث بھی۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن سیاسی اعتبار سے بندھی ہوئی مٹھی کے مانند تھے۔ ثالثاً یہ کہ ان حالات میں کوئی اور ابھرنے والی تازہ شخصیت تاک میں بیٹھی ہوئی نہیں تھی۔ پی این اے کی ساری محنت، ساری کوشش، ساری قربانیوں اور تمام تر جدّوجہد کا فائدہ فوج نے اٹھالیا۔ چنانچہ جیسے پہلے پکی پکائی کھیر بھٹو صاحب نے کھائی تھی ایسے ہی ضیاء الحق صاحب اور ہماری فوج کو پکی پکائی کھیر کھانے کا موقع مل گیا اور اس طرح اس غریب ترین ملک کے بعض جرنیل دنیا کے امیر ترین جرنیلوں میں شمار ہونے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق صاحب نے اپنے جرنیلوں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور ان کے مابین ایک "شریفانہ معاہدہ" (Gentleman Agreement) تھا۔ ضیاء صاحب نے گویا ان سے کہہ رکھا تھا کہ تم جس طرح چاہو کھاؤ پیو، موج اڑاؤ، مجھے حکومت کرنے دو۔ مجھے فری ہینڈ دو کہ میں جس طرح چاہوں مولویوں کی ناز برداری کرتا رہوں، انہیں فائیو سٹار ہوٹلوں میں ٹھہرالوں یا ذرا ان کے لئے کاروں کے دروازے کھول دیا کروں۔ اس "شریفانہ معاہدے" کے بغیر وہ چل ہی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ، خود ان کے اپنے الفاظ میں، ان کا حلقہ انتخاب (constituency) فوج تھی۔

میں نے یہ بات ضیاء الحق صاحب سے بالواسطہ کہی بھی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں مَیں اپنے بیٹے ڈاکٹر عارف رشید کے نکاح کے لئے کراچی گیا ہوا تھا۔ ان دنوں ضیاء الحق صاحب نے اپنی پہلی کابینہ برطرف کی تھی جس میں پروفیسر خورشید صاحب اور فاروقی صاحب وغیرہ شامل تھے اور عمرے پر جاتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ واپس آکر نئی کابینہ تشکیل دیں گے۔ ان کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر نورالٰہی سرجن میرے پاس ان کا پیغام لے کر آئے کہ آپ کو

اگر اسلام کے لئے کام کرنا ہے تو حکومت میں آئیں' میری مرکزی کابینہ میں وزارت سنبھالیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری طرف سے انہیں دو باتیں کہہ دیجئے۔ ایک تو یہ کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ ہر کام کے لئے ایک خاص تربیت درکار ہوتی ہے' میں اس کوچے میں کبھی گیا نہیں' نہ میرا بیوروکریسی سے رابطہ رہا ہے' اس لئے میں شاید اس کام کے لئے موزوں ثابت نہ ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ آپ کی حکومت فوج کی حکومت ہے' جس نے ہمیں کرنے کچھ بھی نہیں دینا ہے۔ خواہ مخواہ کی بدنامی ہم پر آئے گی لیکن آپ نے ہمیں کچھ کرنے کا اختیار دینا نہیں ہے۔ ڈاکٹر نور الٰہی صاحب آج بھی زندہ ہیں' آپ ان سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میری بات سن کر انہوں نے کہا کہ میں نے ضیاء الحق صاحب سے اپنے طور پر بھی یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کو قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی مجلس شوریٰ قائم کی تو میں نے اس میں شمولیت قبول کر لی۔ اس لئے کہ اس میں تو اختیارات والی کوئی بات ہی نہیں تھی' شوریٰ میں تو مشورہ دینا تھا اور وہ میں انہیں مسجد کے منبر سے بھی دیا کرتا تھا۔ یہیں سے میں نے انہیں کرکٹ کے بارے میں مشورہ دیا تھا جبکہ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے' لیکن مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے ابوظہبی جا کر میری بات کو غلط طریقے پر بیان کیا اور میری جانب وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی تھی۔ بہرحال میں چونکہ انہیں پہلے بھی مشورے دیا کرتا تھا لہٰذا اس خیال سے ان کی مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کر لی کہ ملک و قوم کی خیر و فلاح کے لئے براہ راست مشورہ دینے کا موقع مل رہا ہے تو اسے کیوں ضائع کروں۔ لیکن مجلس شوریٰ کے دوسرے اجلاس ہی میں مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس مجلس کی حیثیت "Window Dressing" سے زیادہ نہیں ہے' اور یہ محض امریکی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کے لئے ہے کہ میری حکومت خالص فوجی حکومت نہیں ہے' اس میں مملکت کے شہری بھی شریک ہیں' اس کے سوا کوئی فائدہ اس شوریٰ کا نہیں ہے۔ چنانچہ میں اس سے استعفاء دے کر آ گیا۔

موجودہ حالات کا ۷۰-۱۹۷۱ء کے حالات سے تقابل

موجودہ حالات سے تقابل کے ضمن میں میں نے ۱۹۷۷ء کے حالات کی تین چیزیں

آپ کو نوٹ کروائی ہیں۔ ایک یہ کہ بھٹو کی حکومت مستحکم تھی۔ دوسرے یہ کہ قومی اتحاد (PNA) بھی منظم تھا۔ اور تیسرے یہ کہ کوئی نئی سیاسی ابھرتی ہوئی شخصیت' خصوصاً کسی بیرونی سرپرستی کے ساتھ نہیں تھی' لہٰذا جو کچھ ہوا اندرونی طور پر ہوا اور مارشل لاء لگ گیا۔ ان حالات کا ۶۹ء تا ۷۱ء کے حالات سے تقابل کیجئے۔ اولاً' ایوب خان گزشتہ گیارہ برس سے اقتدار میں تھا اور لوگ اب اس سے بیزار بھی ہو چکے تھے۔ وہ گویا ایک گرتی ہوئی دیوار تھا' جو چند مراحل میں زمین پر آ رہی۔ ثانیاً یہ کہ اس وقت بھی "Free For All" کی پوزیشن تھی۔ حزب مخالف کی جماعتوں کی حیثیت بھی کسی منظم ادارے کی نہیں تھی۔ مختلف گروپس علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی گیم کھیل رہے تھے۔ ایک طرف "بھٹو بھاشانی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے' لیکن دوسری طرف وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے خلاف چالوں میں مصروف تھے۔ اور تیسری بات یہ کہ اس وقت ایک تازہ ابھرتا ہوا شکاری بھٹو تاک میں تھا۔ آج کے حالات بھی یہی ہیں۔ بے نظیر کی حکومت کا چل چلاؤ ہے۔ میں یہ بات تین ہفتے قبل کہہ چکا ہوں کہ تبدیلی کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس ضمن میں میں خاص طور پر ارشاد احمد حقانی صاحب کے آرٹیکل (شائع شدہ روزنامہ جنگ) کو اہمیت دیتا ہوں' اس لئے کہ وہ ایک اعتبار سے صدر مملکت کا ماؤتھ پیس ہیں' جیسے کسی زمانے میں مصر کے ایک اخبار نویس حسنین ہیکل صدر ناصر کا ماؤتھ پیس ہوا کرتے تھے۔ وہ ان کے مشیر بھی تھے اور ان کی بات گویا کہ صدر ناصر کی بات ہوتی تھی۔ ارشاد احمد حقانی صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ اب اس حکومت کا چل چلاؤ ہے۔ چنانچہ "ایک دھکا اور دو" کا نعرہ لگا کر دھکا دینے والے اسے مختلف طریقوں سے دھکے دینے کی فکر میں ہیں' اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنا دھکا علیحدہ چلانا چاہتا ہے اور PNA کی طرح کا کوئی اتحاد اس وقت موجود نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے ۲۴ جون کے دھرنے کا اعلان کیا تو مسلم لیگ نے ۲۳ جون کی ہڑتال کی کال دے کر گویا "دہلے پہ نہلا" مار دیا۔ پھر ان کی طرف سے ۳ جولائی کی کال آئی تو مسلم لیگ نے ۴ جولائی کو عوامی اسمبلی لگا کر "نہلے پہ دہلا" دے مارا۔ اب مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء اسلام بھی یوم احتجاج منا رہی ہے اور قاضی صاحب کا بیان آیا ہے کہ ہم اس کا بھی ساتھ دیں گے۔ یہ سب اوپرے

بیانات ہیں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے داؤ پر ہے۔ اور بعض لوگوں نے تو صاف کہہ بھی دیا ہے کہ اب یہ بات نہیں ہو گی کہ محنت ہم کریں اور کھیر کوئی اور کھائے۔ لیاقت بلوچ صاحب نے بیان دیا ہے کہ خون ہم دیں گے تو چوری کسی اور کو نہیں کھانے دیں گے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے دھرنے میں یہ بات پہلے سے طے شدہ تھی کہ قاضی صاحب کے سوا کسی اور کو تقریر کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور مجھے جماعت کے ایک ذمہ دار شخص نے بتایا ہے کہ ان کے بعض کارکن تو نواز شریف صاحب سے اتنے نالاں اور ناراض ہیں کہ انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہمارے جلسے میں آئیں گے تو ہم ان پر اینٹیں برسائیں گے۔ میں اس وقت نواز شریف کے حق میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں نہ قاضی صاحب کے حق میں' اور نہ ہی ان کے خلاف۔ بلکہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حالات کا نقشہ کیا ہے؟ اسے فری سٹائل کشتی کہہ لیں یا "فری فار آل" والا معاملہ کہہ لیں' وہ بات نہیں ہے کہ جو قومی اتحاد کی تحریک میں بندھی ہوئی مٹھی والا معاملہ تھا۔ وہاں تو آخری درجے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی ورنہ وہ تحریک بہترین نتائج لے جاتی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ پی این اے کا جو معاہدہ ہو گیا تھا وہ اگر روبعمل آ جاتا تو واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے اندر ایک بہت بڑی نظیر قائم ہو جاتی کہ یہاں ایجی ٹیشن کے ذریعے سے بھی بات منوائی جا سکتی ہے اور ایک ایسے شخص کو جھکا کر مذاکرات پر مجبور کیا جا سکتا ہے جس نے کہا تھا کہ "میری کرسی بہت مضبوط ہے"۔ اُس وقت ایئر مارشل اصغر خان صاحب کی ہٹ دھرمی آڑے آ گئی' ورنہ ضیاء الحق صاحب کے لئے مارشل لاء لگانے کا کوئی جواز تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

تیسرے یہ کہ اس وقت بھی ایک نیا شکاری تاک میں ہے۔ اور وہ عمران خان ہے جسے بیرونی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ جس شخص کی شادی میں ہنری کسنجر شریک ہوں اس کے بارے میں بھی کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ اسے بیرونی سپورٹ حاصل نہیں ہے۔ قبل ازیں عمران خان "ریگولر ٹیک آف" کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس میں تو وہ بری طرح ناکام ہو گئے' ان کی تحریک انصاف کے معدودے چند دفاتر قائم ہوئے اور بہت تھوڑے لوگ ان کے ساتھ آئے۔ اب بھی اگر کچھ قوتیں انہیں آگے لانا چاہیں گی تو وہ

الیکشن کے ذریعے نہیں ہو گا' اور خود عمران خان کی یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ الیکشن کی ضرورت ہی پیش نہ آئے"۔

موجودہ حالات کے یہ تین عوامل ایسے ہیں جو ۱۹۷۷ء میں موجود نہیں تھے' لیکن ۶۹ء تا ۷۱ء کے حالات میں موجود تھے۔ ان کا جو نتیجہ نکلے گا وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے لئے عذاب کا کوئی آخری فیصلہ ہو گیا ہو یا آخری "عذابِ استیصال" سے قبل ۱۹۷۱ء جیسے کسی عذاب کا کوڑا ہماری پشت پر پڑنے والا ہو۔ اس ضمن میں مَیں نے اپنی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری" میں قدرے تفصیل سے بات کی ہے۔ میں ایک تلخ حقیقت بیان کر رہا ہوں' جسے یقیناً بہت سے لوگ پسند نہیں کریں گے' کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہم ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم اپنا یہ استحقاق ثابت نہیں کر سکے۔ قائداعظم کا یہ جملہ میرے ذہن و قلب پر نقش ہے جو میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصۂ تعلیم کے دوران بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہو گا' جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا :

"God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new nation and let it not be said that we did not prove equal to the task."

یعنی "(مملکت خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ایک نئی قوم کے معماروں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے اپنی اہلیت و صلاحیت کو ثابت کر سکیں۔ اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نصف صدی کے عرصے میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اشعار کے مصداق عفو و درگزر کا معاملہ فرمادے ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!

سو اللہ تعالیٰ کی رحمت دستگیری فرمائے تو یہ اس کا کرم ہے' ورنہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے ہمیں دنیا میں جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ بہرحال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک جھٹکا لگے اور ہم جاگ جائیں۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب ختم ہو جائے۔

قاضی صاحب کا ایجی ٹیشن اور اس کے ممکنہ نتائج

اس پس منظر میں مَیں قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ جماعت اسلامی کا مستقل موقف یہ رہا ہے کہ وہ دستوری و انتخابی راستے سے ہی تبدیلی لائے گی جبکہ ہمارا ان سے اختلاف ہی یہ رہا ہے کہ یہاں انتخابی راستے سے اسلام نہیں آسکتا۔ اگرچہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک یہاں اسلام نہیں آ جاتا ملکی سیاست کی گاڑی دستور کے مطابق چلتی رہے' انتخابات ہوتے رہیں' لیکن جو لوگ یہاں اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ اپنا وقت انتخابات میں ضائع نہ کریں' بلکہ ایک بھرپور ایجی ٹیشن کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ بقول اقبال ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

یعنی پہلے دعوت و تربیت کے مراحل طے کرتے ہوئے سمع و طاعت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ایک منظم جماعت تیار کرلیں اور پھر "ایک وار والا" بھرپور ایجی ٹیشن کریں۔ لیکن ان کا موقف یہ رہا ہے کہ یہ کام دستوری اور انتخابی راستے سے ہی ہو گا' یہ دوسرا راستہ صحیح نہیں۔ دستوری اور جمہوری راستے میں اب تک جو بڑی بڑی رکاوٹیں آئیں' مثلاً مسلسل مارشل لاء لگتے رہے' اس وجہ سے قوم سیاسی اعتبار سے نابالغ ہو گئی اور ہمارے ہاں سیاسی و جمہوری ادارے مستحکم نہ ہو سکے۔ تاہم اب ہم تقریباً اس سطح پر پہنچ گئے تھے کہ اب اس ملک میں دو پارٹیاں مستحکم ہو گئیں' یعنی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ۔ بعض لوگ

میری زبان سے پیپلز پارٹی کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پیپلز پارٹی بہرحال ایک پارٹی ہے۔ یہ بات میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں جب کالم نویس میری اس بات پر استہزاء کیا کرتے تھے۔ خواہ یہ میری یا آپ کی پسندیدہ پارٹی نہ ہو، جمہوری نہ ہو، لیکن پارٹی تو ہے نا۔ قائداعظم کی مسلم لیگ بھی کوئی خاص جمہوری پارٹی نہیں تھی۔ اس میں آخری اور اصل فیصلہ قائداعظم کا ہوتا تھا۔ اور تحریکیں چلتی ہی شخصیتوں کے بل پر ہیں۔ اس حوالے سے نواز شریف صاحب نے محنت و مشقت کر کے، قربانیاں دے کر، تکلیفیں جھیل کر مسلم لیگ کو ایک مستحکم پارٹی بنایا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اصل مسلم لیگ ان کی ہے یا جونیجو لیگ ہے، بہرحال ایک مسلم لیگ اب نواز شریف کی قیادت میں مستحکم ہے، جو حکمران جماعت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہے۔ اب اگلا تقاضا یہ تھا کہ جمہوری اصولوں کے مطابق اس گاڑی کو چلایا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپوزیشن نے بہت سے پوائنٹ حاصل کئے ہیں۔ سرے محل کا معاملہ بھی نواز شریف صاحب ہی عوام کے سامنے لے کر آئے ہیں۔ اگرچہ اب قاضی صاحب بھی کچھ چیزیں نکال کر لا رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ سٹیل مل کے معاملات میں جس طرح بے ضابطگیاں ہوئی ہیں وہ انہیں ثابت کر سکتے ہیں، لیکن عربی مقولے "الفَضلُ لِلمُتقدم" کے مصداق نواز شریف کو اس معاملے میں ان پر سبقت حاصل ہے۔ سرے محل کا معاملہ منظرعام پر آنے کے بعد بے نظیر کا ردعمل جس طرح نرم ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندر سے ہل گئی ہے۔ دوسری طرف سے عدلیہ کا دباؤ بھی حکومت پر بڑھ رہا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بھی ایک دستوری معاملہ ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ گیم اپنے رولز کے مطابق آگے بڑھتی، لیکن ایسے میں اچانک قاضی صاحب کی طرف سے ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ گویا کہ وہ ملکی سیاست کی گاڑی کو دستوری پٹڑی پر آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ ایجی ٹیشن کے پہلے سے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے لئے کوئی بات واضح نہیں کی گئی۔ پہلے سے نہ تو کوئی ایشوز (issues) دیئے گئے اور نہ ہی مطالبے واضح کئے گئے۔ اچانک فیصلہ ہوا کہ اب دھرنا ماریں گے۔

اس کے دو ہی امکانی اسباب ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ فیصلہ انتہائی مایوسی (Out of sheer frustration) میں کیا گیا کہ اب پھر انتخابات ہوئے تو ظاہر بات ہے کہ نواز شریف صاحب ہی جیتیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آخری داؤ کھیلا تاکہ وہ اس میدان میں اپنی کوئی حیثیت منوا سکیں۔ میرے پاس ایک ایسے رکن جماعت کی شہادت موجود ہے جو ایک وقت میں صوبائی وزیر بھی رہے ہیں کہ اس ضمن میں شوریٰ کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا' کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور قاضی صاحب کا یہ فیصلہ بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع طور پر سامنے آیا۔ اس کی ایک امکانی وجہ تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب کچھ انتہائی فرسٹریشن کے عالم میں کیا گیا اور دوسری وجہ' جو میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا' لیکن اس رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ کہیں سے کوئی "اشارہ" ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی طرف سے کوئی تحریک ملی ہو۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک کہاں سے ملی ہے' کس کی جانب سے ملی ہے' کیوں ملی ہے' کس کے واسطے سے ملی ہے' اس کے پیچھے اصل کون ہے اور براہ راست سامنے کس سے بات ہے۔ پھر یہ کہ یہ معاملہ شعوری طور پر ہو رہا ہے یا غیر شعوری طور پر۔ اس لئے کہ عالمی معاملات بڑے لطیف اور پراسرار (subtle) انداز میں ہوتے ہیں' کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم اس وقت کسی کا کھیل کھیل رہے ہیں یا کسی کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ جانیں دینے والے افغان مجاہدین کو کیا پتہ تھا کہ ہم امریکہ کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا نا! اور بعد میں شاید ہمارے کشمیری مجاہدین کو بھی پتہ چلے کہ یہ تو کسی اور کا کھیل تھا' جانیں ہم نے دیں لیکن ثمرات کوئی اور لے گیا۔ اسی طرح PNA کا معاملہ اگرچہ برجستہ و بے ساختہ (Spontaneous) اور مقامی (indigenous) تھا' لیکن عالمی استعمار نے اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔ یہی حال شاہ ایران کے خلاف تحریک کا تھا۔ اور یہ دونوں دنیا سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ "ہمیں امریکہ نے مروا دیا"۔ اس لئے کہ بھٹو بھی چاہتا تھا کہ ہم ایٹم بم بنائیں اور شاہ ایران بھی ایٹم بم بنانا چاہتا تھا۔ حالانکہ امریکہ کو ان دونوں کا سرپرست تصور کیا جاتا تھا' بلکہ شاہ ایران تو اس علاقے

جیسا کہ میں نے عرض کیا' قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن کے ایشوز (issues) بھی واضح نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایشو کرپشن ہے۔ لیکن کرپشن بھی کوئی ایک دن میں تو پیدا نہیں ہو گئی۔ سنا ہے کہ کسی کالم نویس نے بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے کہ قاضی صاحب کا تو بیرونی اسفار کا شیڈول بنا ہوا تھا۔ کابل میں معاملات نمٹانے کے بعد انہوں نے ترکی جانا تھا' جہاں سے واپس آنے کے بعد یہاں تھوڑا سا قیام کر کے ملائشیا جانا تھا' لیکن وہ ترکی سے واپس آئے تو انہیں اچانک معلوم ہوا کہ پاکستان میں تو کرپشن زوروں پر ہے' لہٰذا انہوں نے سوچا کہ میں ملائشیا کیسے جاؤں' پہلے یہاں کرپشن ختم کر لوں۔ اس کے علاوہ مہنگائی اور افراطِ زر بھی مسلسل ہے' کوئی ایک دن کی بات نہیں۔ پیسے کی قیمت مسلسل گر رہی ہے اور چیزوں کی قیمتیں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے فیصلے ہماری حکومتوں کے ہاتھوں نافذ ہوتے ہیں۔ ایک قومی اخبار میں ایک بڑا خوبصورت کارٹون تھا کہ ایک طرف آئی ایم ایف ایک دیو قامت یانکی (Yankee) کی صورت میں دھرنا مارے بیٹھا ہے جس کی گود میں CBR (سنٹرل بورڈ آف ریونیو پاکستان) رکھا ہے اور دوسری طرف چھوٹے سے قاضی صاحب دھرنا مارے بیٹھے ہیں۔ اس کارٹون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس ملک پر اصل دھرنا تو آئی ایم ایف کا ہے اور ہماری حکومت کی حیثیت ان کی کٹھ پتلی کی ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ان کے اشارے پہ ہوتا ہے۔ سو اس حوالے سے بھی اس ایجی ٹیشن کا کوئی ہدف معین نہیں ہے۔

پھر یہ بات اہم ہے کہ اس ایجی ٹیشن کا پہلا مرحلہ پُرامن نہیں رہ سکا۔ اس کی عدالتی تحقیقات ہونی چاہئیں کہ پہلی گولی کس نے چلائی اور اس میں ہونے والی اموات کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ایک بات تو طے ہے کہ کارکنوں نے مثالی نظم و ضبط کا مظاہرہ نہیں کیا اور مرکز کی ہدایات کا خیال نہیں رکھا۔ مرکز کی طرف سے کارکنوں کو حکم تھا کہ کہیں بھی تصادم کا راستہ اختیار نہ کیا جائے' جہاں بھی حکومت کی طرف سے مزاحمت ہو اور روکا جائے قافلہ وہیں پر رک جائے اور وہیں دھرنا دے دیا جائے۔ چنانچہ سرحد میں اسی پالیسی پر عمل ہوا اور وہاں سے کوئی قافلہ لڑتا بھڑتا ہوا اسلام آباد تک نہیں پہنچا۔ لیکن مجھے لاہور

ہمارے قافلے نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا کہ ہم زبردستی راستہ بنائیں گے۔ گویا کہ مرکزی کمانڈ کا حکم توڑنے کا فیصلہ لاہور سے چلنے والا سب سے بڑا قافلہ طے کر چکا تھا۔ میں صرف اسی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ گڑبڑ کا آغاز مظاہرین کی طرف سے ہوا ہو۔ ورنہ اگر پُرامن مظاہرے ہوتے رہیں تو حکومت کی صحت پر کونسا برا اثر پڑے گا۔ اسے پولیس کو تنخواہ تو دینی ہے' خواہ وہ پولیس لائن میں بیٹھے یا سڑک پر آ جائے۔ لیکن لوگ آئے روز اپنے دھندے اور کاروبار چھوڑ کر سڑکوں پر آ afford نہیں کر سکتے۔ "دھرنا" تو یہ ہوتا ہے کہ آپ مطالبات منوانے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے' کہ جب تک یہ مطالبات منظور نہیں ہوں گے ہم یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ لیکن اب جو دھرنے کے نام سے مظاہرے شروع کئے گئے ہیں اس سے حکومت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ میں اس پر قہقہے پڑے ہیں اور قاضی صاحب نے غصے میں کہا ہے کہ نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد دانت نکالتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ اور اگر کہیں انہوں نے "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق کوئی معاملہ کیا اور تصادم کی پالیسی اپنائی تو پھر سوائے "Chaos" کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا' یا پھر بھٹو صاحب کی اصطلاح میں "دمادم مست قلندر" ہو گا' جس کے نتیجے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون آ جائے گا۔ اس کا امکان موجود ہے کہ ایک بار پھر وہی معاملہ ہو کہ ساری کھیر پکائے کوئی اور' کھائے کوئی اور!!! اس ملک میں جو پہلا سیاسی اختلال و انتشار (Chaos) پیدا ہوا تھا اس کا باعث بھی بدقسمتی سے ایک مذہبی جماعت بنی تھی اور اب جس Chaos کی تیاری ہو رہی ہے اگر وہ رونما ہو گیا تو یہ بھی ایک مذہبی جماعت کے ذریعے ہو گا۔

احوالِ بھارت

سرحد کے پار جو صورت حال ہے اس کے ضمن میں ایک بات اچھی طرح جان لیجئے کہ پاکستان کا وجود ہر ہندو کے دل میں ایک کھٹکتا ہوا کانٹا ہے۔ اس کے دماغ میں' اس کے دل میں اور اس کے وجود کے رگ و پے کے اندر "مہابھارت" کا تصور سرایت کئے ہوئے ہے۔ دوسرے یہ کہ بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) اس وقت بھارتی پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اس کی وہاں صرف تیرہ دن کی حکومت بنی۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ وہاں سب جماعتوں نے بڑی بالغ نظری کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے ہاں کے مبصرین نے بھی اس پر تبصرے لکھے ہیں۔ لیکن اب وہاں سے موجودہ حکومت میں دراڑیں پڑنے کی خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ فلاں رکن ناراض ہو کر چلا گیا اور فلاں اٹھ کر چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ بھان متی کے اتنے بڑے کنبے کو جوڑ کر لے کے چلنا بہت مشکل کام ہے۔ اور جب بھی یہ حکومت ٹوٹی تو اسی کے کچھ گروپس بی جے پی کے ساتھ مل کر حکومت بنائیں گے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہو سکتا ہے میں اس کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔ سبرامنیم انڈیا کا ایک بڑا سیاسی تجزیہ نگار تھا' اس نے ۱۹۷۱ء میں ایک مضمون لکھا تھا کہ اس وقت مشرقی پاکستان کی جو پوزیشن ہے یہ ہمارے لئے ایک نادر موقع ہے۔ اس کے الفاظ تھے :

"This is the chance of the centuries, we cannot afford to lose it."

یعنی ایسا موقع تو صدیوں بعد آیا کرتا ہے' ہم کہیں اسے ضائع نہ کر بیٹھیں۔ اور انہوں نے فی الواقع اسے ضائع نہیں کیا۔ اللہ نہ کرے کہ بھارت میں پھر ایسی کوئی حکومت قائم ہو جو "چانس آف دی سنچری" سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو۔

بھارتی مسلمانوں کے بارے میں مَیں ایک بات یہ نوٹ کرانا چاہتا ہوں کہ اب ان میں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اگرچہ بھارت کے مسلمان فوجی تو پاکستان کے خلاف لڑے' اور کھیم کرن سے آگے پاکستانی دستوں کی یلغار کو روکنے والے بھارتی مسلمان فوجی ہی تھے' جن میں حوالدار نور محمد کو بھارت کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "اشوکا چکر" ملا تھا' لیکن وہاں کے عام مسلمانوں کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔ اب وہ کیفیت بھی بہت حد تک بدل چکی ہے اور بھارت کے عام مسلمان کو بھی اب آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ندائے خلافت کے ۸ جولائی کے شمارے میں ایک خاتون ثمین طاہر خان کے تاثرات شائع ہوئے ہیں' جو انہوں نے بھارت کا سفر کر کے تحریر کئے ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کی سوچ اور ان کے رویّے میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ضلع سہارنپور (یوپی) سے آئے ہوئے ایک مسلمان جوڑے نے مجھ سے ملاقات میں اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کیا' جس سے اندازہ ہوا کہ اب

وہاں کے مسلمانوں کی سوچ کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان نے آخر انہیں دیا ہی کیا ہے انہوں نے جو قربانیاں دیں پاکستان کے لئے دیں اور جو بھی دکھ سہے پاکستان کے لئے سہے' لیکن پاکستان نے انہیں کیا دیا؟ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری خواتین ماتھے پر بندیا لگا لیتی ہیں یا مانگ میں سیندھور ڈال لیتی ہیں تو کونسی قیامت آ جاتی ہے؟ تمہاری عورتوں نے کونسی ثقافت اختیار کی ہوئی ہے؟ ان کی اس بات کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟؟

بھارت کے احوال کے ضمن میں آخری بات یہ کہ اب بھارت دوسرا دھماکہ کرنے پر تلا ہوا ہے' امریکہ کی وارننگ ایسے ہی نہیں آئی۔ یہ حالات ہیں ہماری مشرقی سرحد کے اوپر۔

افغانستان کی موجودہ صورتحال

اور اب آیئے افغانستان کی موجودہ صورت حال کی طرف۔ ندائے خلافت کے ۸ جولائی ہی کے شمارے میں پشاور سے مولانا راحت گل صاحب کا ایک بڑا دردمندانہ استفتاء شائع ہوا ہے۔ مولانا گزشتہ دنوں پورے افغانستان کے علاقے کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ افغانستان میں اِس وقت دو مستحکم حکومتیں قائم ہو چکی ہیں اور دونوں اسلامی ہونے کی مدعی ہیں' جبکہ دونوں میں سانپ اور نیولے کا بیر ہے۔ قندھار میں طالبان کی اسلامی شرعی حکومت قائم ہے جس کے سربراہ امیرالمومنین ملا محمد عمر ہیں' جن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔ افغانستان کے ایک تہائی علاقے' یعنی پچاس میں سے سترہ اٹھارہ صوبے ان کے زیر نگیں ہیں۔ دوسری جانب برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار وغیرہ کے مابین جو بیر تھا وہ ختم ہوا ہے اور مرکز میں ایک مستحکم حکومت قائم ہو رہی ہے۔ جبکہ تیسری جانب ابھی دوستم ان دونوں سے الگ ہے۔ اس طرح افغانستان اِس وقت تین ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ جس طرح ۱۹۹۱ء کی جنگ کے بعد عراق کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا' اوپر اور نیچے دو "نو فلائی زون" بنا دیئے گئے تھے اور عراق صرف درمیانی علاقے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا' اسی طرح کا معاملہ افغانستان کا ہو گیا ہے۔ مولانا راحت گل صاحب

نے علماء دین سے سوال کیا ہے کہ اب اگر قندھار کی شرعی حکومت اور مرکز کے درمیان جنگ ہوئی تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی اور ایسے میں غیر جانبدار مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟

افغانستان کے حالات کی بہتری میں جو پیش رفت ہوئی اس میں قاضی حسین احمد صاحب کا کردار واقعتاً لائق تحسین ہے۔ میں نے اس پر اپنے ذاتی حلقوں میں بھی قاضی صاحب کی بہت تعریف کی تھی اور میں خود جاکر قاضی صاحب کو مبارکباد بھی دینا چاہتا تھا' لیکن قاضی صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہیں دے سکے۔ قاضی صاحب کی کوششوں سے گلبدین حکمت یار' برہان الدین ربانی اور عبدالرب رسول سیاف کے تین بڑے گروہوں کا ایک مشترکہ میثاق پر متحد ہو جانا ایک بہت ہی مستحسن بات ہے۔ اس کے بعد ضرورت ہے کہ طالبان کو بھی گفت و شنید پر آمادہ کیا جائے۔ اگر قاضی صاحب اس کام میں مزید محنت صرف کرتے اور اپنی توجہات کو وہاں مرکوز کرتے تو شاید بہت سا خیر برآمد ہو جاتا اور حالات میں مزید بہتری ہوتی۔ ورنہ حمید گل صاحب بھی جاکر اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آ گئے تھے لیکن گلبدین حکمت یار اور ربانی صاحب کے مابین مفاہمت نہیں کرا سکے تھے۔ اب حالات کا بھی تقاضا ہے کہ اس عمل کو مزید آگے بڑھایا جائے۔ پاکستان میں ملی یکجہتی کونسل میں جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑے شامل ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا سمیع الحق صاحب دونوں کی جماعتوں کے اثرات طالبان کے اندر موجود ہیں۔ مفاہمت کے لئے ان اثرات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب اگر محنت کر کے مزید وقت لگاتے تو وہاں کوئی بہتر نتیجہ نکلتا۔ لیکن انہوں نے یہاں پر اپنی نئی سکیم شروع کر دی۔

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ اور حالیہ ایجی ٹیشن

اپنی گفتگو کے آخر میں میں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اسلامی انقلاب کے لئے جس ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں اس میں اور قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن میں کیا فرق ہے۔ ہمارا موقف یہی ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کے لئے آخری مرحلہ ایجی ٹیشن ہی ہے۔ قاضی صاحب کا ایجی ٹیشن اگرچہ وہ تقاضے پورے نہیں کرتا جو اسلامی

انقلاب کے لئے ناگزیر ہیں' اس کے باوجود لوگوں نے اس کی برکات کا بچشم سر مشاہدہ کر لیا۔ جماعت اسلامی جو کہ بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی اور دھندلکوں میں اوجھل ہو رہی تھی اس ایجی ٹیشن سے ایک دم فرنٹ لائن کے اندر آ گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ میں ایجی ٹیشن ہی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے اور انتخابی عمل سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تاہم ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب کی خاطر کئے جانے والے ایجی ٹیشن کی کچھ شرائط ہیں۔

اس کے لئے پہلے ایک انتہائی منظم اور مضبوط جماعت کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کر چکے ہوں۔ کیا قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن میں شریک ہزاروں افراد اس شرط پر پورا اترتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کے لئے تہنیت اور مبارک باد ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ ہزاروں افراد جماعت اسلامی کے رکن کیوں نہیں بن گئے؟ رکنیت کے لئے ظاہر ہے کہ دین و شریعت پر عمل ہی کی شرط پوری کرنا ہو گی' پھر جماعت کا رکن بننے میں ان کو کیا رکاوٹ ہے؟ پھر کبھی پاسبان اور کبھی شبابِ ملی کا تکلف کیوں؟ دراصل وجہ یہ ہے کہ

حدیث من اپنا پرانی پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

ایجی ٹیشن کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن دین پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور ایسے ایجی ٹیشن سے کوئی خیر برآمد نہیں ہو گا۔ ہمارے پیش نظر جو ایجی ٹیشن سے اس میں وہ لوگ شریک ہوں جو پہلے اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کر چکے ہوں اور اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اللہ کے دین کو قائم کر چکے ہوں۔ پھر یہ لوگ ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایک مضبوط اور منظم جماعت کی شکل اختیار کریں۔ پھر یہ جماعت ایجی ٹیشن شروع کرے۔ دوسری جماعتوں سے اگر تعاون حاصل کرنا ہو تو کم از کم ایک وفاق کی شکل تو ہو' کوئی پی این اے کی سطح کا اتحاد ہو جس کا ایک نظم تھا' ڈسپلن تھا' سارے فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے تھے۔ اِس وقت جو صورتحال ہے کہ ہر پارٹی اپنا ہی کھیل کھیل رہی ہے' اس سے کوئی بات نہیں بنے گی۔

پھر یہ کہ ایجی ٹیشن کے ایشوز (issues) اور مطالبات واضح طور پر دینی ہونے چاہئیں' تاکہ آپ کے ملک کے عوام کی اکثریت جو دین کا کچھ فہم و شعور رکھتی ہے' اگرچہ عمل سے عاری ہے' اسے واضح طور پر معلوم ہو کہ یہ ایجی ٹیشن دینی ایشوز کے لئے ہے۔ گڈمڈ ایشوز کے ذریعے اسلامی انقلاب آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اگر یہ شرطیں پوری کرنے کے بعد دھرنا دیا جائے گا تو وہ پھر دھرنے کی شکل میں مظاہرہ نہیں ہو گا۔ پھر قدم پیچھے ہٹانے والی بات نہیں ہو گی۔ پھر تو واضح مطالبات سامنے رکھے جائیں گے کہ ان کے پورے ہونے تک ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہے لاٹھیاں برسیں یا گولیاں چلیں' یہ دھرنا مطالبات کی منظوری تک ختم نہیں ہو گا۔ ورنہ یہ کہ اگر کچھ دنوں کے بعد حکومت کو جھٹکے دیتے رہیں گے تو اس سے کچھ بھی نہیں بنے گا۔ اگر یہ جھٹکے پُرامن رہے تو اندیشہ ہے کہ جگ ہنسائی ہو گی اور پولیس کو ایک مصروفیت ملی رہے گی اور وہ انہیں کوستی رہے گی کہ کیا ہمیں آئے روز کی مصیبت ڈالی ہوئی ہے' یا دوکاندار انہیں کوسیں گے کہ روز روز ہماری مارکیٹیں بند ہو جاتی ہیں' حکومت کا کیا بگڑتا ہے! اور اگر کہیں بدنظمی والا معاملہ ہو گیا تو وہ Chaos پر منتج ہو گا جس سے کسی خیر کی توقع نہیں۔

بہرحال جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس مملکت خداداد پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ سے خیر مانگتے رہیں گے اور اپنے اسی طریق پر عمل پیرا رہیں گے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم
ولسائر المسلمین والمسلمات OO

(مرتب : حافظ خالد محمود خضر)

ضرورت رشتہ

30 سالہ نوجوان' سرکاری ملازم' سید سنی' اردو سپیکنگ کے لئے دینی مزاج کے حامل گھرانے سے نیک سیرت' شرعی پردہ کرنے والی گریجوئیٹ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ : سید آصف حسین۔ 11/46 نیو شالیمار کالونی ملتان روڈ لاہور
فون لاہور (گھر): 7460448(042) اسلام آباد (گھر): 299900 (051)

موجودہ حالات میں
اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ

از قلم : انجینئر نوید احمد، کراچی

الحمدللہ کہ اس وقت امت مسلمہ کی ایک قابل ذکر تعداد اسلام کو محض "مذہب" نہیں بلکہ "دین" سمجھتی ہے۔ "مذہب" انسان کی صرف انفرادی زندگی کے گوشوں یعنی عقائد، عبادات اور رسومات پر مشتمل ہے جب کہ دین انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی اجتماعی زندگی کے پہلوؤں یعنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔ مزید برآں اب ایسے افراد کی بھی مناسب تعداد موجود ہے جو اسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اپنا دینی فریضہ سمجھتی ہے۔ البتہ اسلامی انقلاب کے لئے طریق کار اور خاص طور پر اس کے آخری مرحلے کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ انقلاب، انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے برپا کیا جاسکتا ہے، بعض کے نزدیک یہ کام دعوت اور محض دعوت سے سرانجام دیا جاسکتا ہے اور کچھ اس کے لئے مسلح جدّوجہد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" میں سیرت النبی ﷺ کے حوالہ سے اسلامی انقلاب کا طریق کار اور اس کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے ابتدائی مراحل کے بارے میں تو کوئی اختلاف رائے موجود نہیں ہے، تاہم اس تحریر کے ذریعے اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کی قدرے وضاحت پیش نظر ہے۔

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ "مسلح تصادم"

اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کے لئے جب ہم قرآن حکیم، سنّتِ نبوی اور

تاریخ انسانی پر غور اور منطق کی روشنی میں سوچ و بچار کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ "انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے"۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم' سنتِ نبویؐ تاریخ انسانی اور منطق سے جو دلائل ہمیں ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ سورۃ الانفال (آیت ۳۹) میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

"اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔"

اس آیت میں اہل ایمان کو اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے جب تک کہ کل کا کل نظام زندگی مکمل طور پر اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔ گویا نظام کی تبدیلی کے لئے جنگ ناگزیر ہے۔

۲۔ سورۃ الحدید (آیت ۲۵) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾

"بے شک ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ نازل کیں کتابیں اور ترازو تاکہ لوگ قائم ہوں عدل پر' اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں شدید جنگ (کی صلاحیت) ہے اور لوگوں کے لئے دوسرے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔"

اس آیت کا مضمون بھی از خود واضح ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے کتابیں اور میزان یعنی نظام عدل انبیاء کرام کو اس لئے عطا فرمایا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اس کے لئے ایسے طبقات کی اکثریت پر محض وعظ و نصیحت کارگر نہ ہو گی جو باطل نظام میں دوسروں

کے حقوق غصب کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے علاج کے لئے اللہ نے لوہا بھی اتارا ہے تا کہ ان سے جنگ کی جائے اور عدل و انصاف کے نظام کو بالفعل قائم کیا جائے۔

۳۔ سورۃ الصف (آیت ۹) میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو بھیجا ہی اس مقصد کے لئے ہے کہ وہ کُل نظام زندگی پر دینِ حق کو غالب کریں۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۴ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝﴾

"بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صف در صف گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

دینِ حق کو غالب کرنے کے لئے مسلح تصادم ناگزیر ہے اور اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو اس مقصد کے لئے مسلح تصادم میں پامردی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

۴۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اس کی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہوتا۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے' جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مومن ہے۔ اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔"

اس حدیث میں اللہ اور اس کے رسولوں کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف ہاتھ سے جہاد کو ایمان کا افضل ترین درجہ قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ نبی کریم ﷺ رحمۃٌ للعالمین ہیں اور آپ ہرگز یہ پسند نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ کے بندوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچے۔ لیکن ایسے ظالموں کا سر کچلنے کے لئے جنہوں نے نوع انسانی کو اپنا غلام بنا رکھا تھا' آپ ﷺ کو بھی دعوت سے آگے

بڑھ کر تلوار ہاتھ میں لینی پڑی۔ اس راہ میں آپ کے انتہائی محبوب ساتھیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا' خود آپؐ کو زخم بھی آئے اور آپؐ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔

۶۔ ماضی قریب میں روس' فرانس اور ایران میں جزوی طور پر انقلاب آئے لیکن ان سب کے لئے انقلابیوں کو مسلح تصادم کی راہ سے گزرنا پڑا۔ ایران کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہاں مسلح تصادم یکطرفہ تھا۔ حکومت نے عوام کو کچلنے کے لئے ہتھیار استعمال کئے لیکن عوام کی طرف سے احتجاج پُرامن اور منظم گھیراؤ کی صورت میں رہا۔

۷۔ منطقی اعتبار سے بھی یہ بات واضح ہے کہ کوئی بھی طبقہ اپنے مفادات سے آسانی سے دست بردار نہیں ہوتا۔ ظالمانہ نظام میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو بااختیار ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیاشی کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی تحریک اس ظلم کو ختم کرنے کے لئے اٹھتی ہے تو یہ طبقہ اسے کچلنے کے لئے پوری قوت صرف کرتا ہے اور یوں مسلح تصادم کا مرحلہ ضرور آتا ہے۔

مسلّح تصادم کے لئے مشکلات

اب تک کی بحث سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔ البتہ موجودہ حالات میں مسلح تصادم کی راہ میں دو ایسی مشکلات ہیں جو دورِ نبویؐ میں نہیں تھیں۔

۱۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں باطل نظام کے چلانے والے اور محافظ کافر تھے۔ جو حضورؐ کے ساتھ تھا وہی مسلمان تھا اور جو بھی مخالف تھا وہ کافر تھا' جبکہ آج کے حالات میں تمام مسلمان ممالک میں جو بھی غلط نظام قائم ہے اس کے چلانے والے اور محافظ دونوں کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان میں سے بعض کو ان کے غلط کردار کی وجہ سے فاسق و فاجر تو کہا جا سکتا ہے لیکن دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف مسلح جد وجہد یعنی خروج کے لئے فقہاء نے جو سخت

شرائط رکھی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو افراد اٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ کامیابی یقینی نظر آ رہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیا جائے جس کا نتیجہ بدامنی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ نکلے۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں اس شرط کا پورا کرنا آسان نہیں ہے۔

۲۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جنگی مہارت اور ہتھیاروں کے اعتبار سے مسلمانوں اور کفار میں زیادہ فرق نہ ہوتا تھا۔ دونوں طرف لڑنے والوں کی جنگی مہارت یکساں ہوتی تھی اور ان کے ہتھیار بھی ایک جیسے تھے۔ گویا کمیت کا فرق تو تھا کیفیت کا فرق نہ تھا' جب کہ آج کے زمانے میں باطل نظام کی حفاظت کے لئے حکومت کے پاس ہر طرح کے وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں ایسی ہمہ وقت فوجیں (Standing Armies) ہیں جو جنگ کے لحاظ سے پوری طرح تربیت یافتہ' منظم اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں۔ دوسری طرف انقلاب کی جدوجہد کرنے والے عوام نہ اس طرح کی جنگی مہارت کے حامل ہیں اور نہ ہی جدید ہتھیار رکھتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے مسلح تصادم میں کامیابی تقریباً ناممکن نظر آتی ہے۔ اس کی ایک واقعاتی مثال مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کی تحریک ہے۔ نفاذ شریعت کے لئے تحریک کے مخلص کارکنوں نے ہتھیار اٹھائے لیکن حکومت نے علاقے کی ناکہ بندی کر کے جدید ہتھیاروں کے استعمال اور بعض علاقوں پر فضائی بمباری کے ذریعے سے تحریک کو کچل کے رکھ دیا۔

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ
"پُرامن اور غیر مسلح منظم احتجاج"

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ :

۱۔ اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔

۲۔ موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا امکان یا اس کے ذریعے کامیابی قریباً ناممکن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ کیا ہوگا؟ موجودہ حالات نے جہاں مسلح تصادم کے مرحلے کو قریباً ناممکن بنا دیا ہے وہیں ایک متبادل صورت بھی فراہم کر دی ہے۔ آج کے دور میں جو بھی جمہوری آزادی ہر ملک میں دی جاتی ہے اس کی بنا پر کسی غلط بات پر حکومت کے خلاف احتجاج کو شہریوں کا حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے ریاست کے خلاف بغاوت تصور نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا آج کے دور میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ پر امن اور غیر مسلح منظم احتجاج کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس احتجاج میں کسی ایسے منکر کو لے کر اٹھنا ضروری ہوگا جس کا خلافِ شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلّم ہو۔ مثال کے طور پر "سودی نظام" وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کا پر امن گھیراؤ' دھرنا دے کر بیٹھنا یا سول نافرمانی کی تحریک ہو سکتا ہے۔ ان پر امن اور منظم مظاہروں کے ذریعے سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس منکر کا قلع قمع کرے اور اللہ کی حدود کو نافذ کرے۔

یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ اسی طرح اس طریقہ میں اقتدار کی طلب نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں دین کو نافذ کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر ہم میدان میں ہیں' گولیوں کے لئے ہمارے سینے کھلے ہیں اور لاٹھیوں کے لئے ہمارے سر حاضر ہیں۔ ہم قید و بند کی آزمائشیں برداشت کرنے کو تیار ہیں لیکن پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہم ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوہ پر عمل کریں گے جنہوں نے مکی دور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں' لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر کا مظاہرہ کیا۔

آخری مرحلے کے آغاز کے لئے شرائط

البتہ اس طرح کے پر امن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ :

فلاں جماعت نے اپنے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے

ساتھ اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کی فرضیت' اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی اہمیت اور اس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں۔ ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات دیئے ہوں۔

۲۔ انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرہ کار میں شریعت کے احکامات پر امکانی حد تک عمل کر کے سیرت و کردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس ان کے قول و فعل کی درستی کے قائل ہوں۔ انہوں نے تزکیہ کے مراحل طے کئے ہوں' ان کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اخروی ہو اور ان کے دل راہ حق میں جان دینے کے لئے بے چین ہوں۔

۳۔ انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں حکم سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظم ہو' مختلف درجات پر تربیت یافتہ افراد نظم کے ذمہ دار ہوں اور تمام کارکنان نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

دعوت' تنظیم اور تربیت کے مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آکر پُرامن احتجاج کا آغاز کرنا چاہئے۔

آخری مرحلے کی اہم شرائط

انقلاب کے آخری مرحلے کے سلسلہ میں دو باتوں کا خاص اہتمام کرنا ہوگا :

۱۔ احتجاج کا موضوع کسی ایسے منکر کے خلاف جدوجہد کو بنانا ہوگا جو مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ مثلاً عریانی و فحاشی کی ترویج' سود' جوا وغیرہ۔

۲۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ احتجاج مکمل طور پر پُرامن ہو' یعنی اپنی طرف سے ہاتھ بالکل نہ اٹھایا جائے' کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہ کی جائے' کسی شے کو آگ نہ لگائی جائے۔ جس طرح مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو پامردی سے برداشت کیا اور اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی' وہی طرز عمل اس اقدام یعنی مظاہروں' گھیراؤ وغیرہ کے معاملے میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہوگا۔ اگر کچھ شرپسند لوگ بدامنی پر اتر آئیں تو انقلابی

جماعت کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ ان کو قابو کر کے حکومت کے حوالے کر دے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔

ماضی قریب میں اس طریق کار کی کامیابی کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی نے اسی طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے مطالبہ دستورِ اسلامی کی تحریک چلائی۔ چونکہ اس وقت تک جماعت اسلامی نے انتخابی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اس لئے دیگر دینی جماعتوں نے بھی اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا' چنانچہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے اسی طریق کار کو اختیار کیا گیا اور کامیابی حاصل کی گئی۔ یاد رہے کہ اس تحریک کی قیادت ایک ایسی شخصیت کر رہی تھی جو معروف معنوں میں سیاسی نہیں تھی۔ ۱۹۸۰ء میں پاکستان میں اہل تشیع نے زکوٰۃ آرڈیننس کے تحت حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور آرڈیننس واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ حکومت کے انکار پر انہوں نے اسلام آباد میں قصرِ صدارت کا پرامن گھیراؤ کیا اور مطالبہ کی منظوری تک دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ حکومت کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے پڑے اور آرڈیننس میں ترمیم کرنی پڑی۔ ایران میں شاہ کے خلاف بھی اہل تشیع نے اسی انداز سے احتجاج کیا۔ فوج نے گولی چلائی اور ہزاروں مظاہرین مارے گئے لیکن احتجاج جاری رہا۔ آخر کار فوج نے اپنے ہی ملک کے عوام پر مزید گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور مظاہرین کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ممکنہ نتائج

پُرامن اور منظم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں :

۱۔ حکومت ان مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کر دے۔ اس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

۲۔ حکومت انقلابی تحریک کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ

کے لئے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اس صورت میں حکومت پر قابض مراعات یافتہ طبقات یعنی سرمایہ دار اور جاگیردار ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی' آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے' گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی؟ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں' یہ کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ ماضی قریب میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے دوران پاکستانی فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت چونکہ کوئی ایک منظم جماعت اقتدار سنبھالنے والی موجود نہ تھی لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

۳۔ اگر حکومتِ وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے' تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے (ان شاء اللہ)۔

ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں' البتہ اس کو بدلنے کی جدّوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں انہی جاں نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے ان شاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی' استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آکر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

مسئلہ اجتہاد کے ضمن میں
علامہ اقبال کی ایک اہم غلط فہمی
اور اس کی اصل بنیاد

حافظ خالد محمود خضر

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾ (المائدہ : ۳)

"آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارا دین' اور تم پر پورا کر دیا ہے اپنا احسان' اور میں نے پسند کیا تمہارے لئے اسلام کو بطور دین۔"

یہ آیۂ مبارکہ سورۃ المائدہ کے آغاز میں وارد ہوئی ہے' جسے "تکمیلِ شریعت کی سورت" کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں سے ہے' اور اس میں شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اعتبار سے تکمیلی احکام وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیۂ مبارکہ کے بعد کھانے پینے کی چیزوں میں حِلّت و حرمت کا تکمیلی ضابطہ اور اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے احکام بیان ہوئے {۱}۔ مزید برآں اس سورۂ مبارکہ میں حدِ سرقہ قطع ید کی صورت میں بیان کی گئی {۲} اور محاربہ (یعنی فتنہ و فساد برپا کرنے اور ڈاکہ و راہزنی) کی انتہائی سخت سزا قتل کر دیئے جانے' سولی چڑھا دیئے جانے' مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جانے' یا ملک بدر کر دیئے جانے کی صورت میں بیان ہوئی {۳}۔ اس کے علاوہ سورۃ البقرہ میں قتلِ عمد کی سزا قصاص بیان کی گئی ہے' یعنی مقتول کے بدلے میں قاتل کو بھی قتل کر دیا جائے' اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا (دیت) لینے پر آمادہ ہو جائیں {۴}۔ پھر سورۃ النور میں زنا کی سزا (زانی یا زانیہ کے غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں) سو کوڑے {۵} اور قذف کی سزا

اسی کو ڑے {۶} مذکور ہے۔

قرآن حکیم کے بارے میں ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو اس نے اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائی' اور اس کے ذریعے نوعِ انسانی کو ایک مکمل ضابطہ حیات عطا فرمایا۔ بقول اقبال ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں!
حاملِ اُو رحمتہٗ لِلعالمیں!!

اور یہ کہ اس میں بیان کردہ احکام کی نوعیت وقتی اور عارضی نہ تھی بلکہ یہ احکام قیامت تک کے لئے بعینہٖ اسی طرح واجب العمل رہیں گے جس طرح اس کے نزول کے وقت تھے۔ اس کا ایک ایک حرف دائمی و غیر مبدّل اور شک و شبہ سے بالاتر ہے ؎

حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو قرآن حکیم دے کر مبعوث فرمایا گیا تو آپؐ کی ذمہ داری صرف اس کا "ابلاغ" ہی قرار نہیں دی گئی' بلکہ اس کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کی تبیین بھی آپ کا فرضِ منصبی ٹھہرایا گیا' از روئے الفاظ قرآنی :

﴿یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ' وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (المائدہ : ۶۷)

"اے رسول' پہنچا دو جو کچھ تم پر اترا تمہارے رب کی طرف سے۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام کچھ نہیں پہنچایا"۔

اور

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (النحل : ۴۴)

"اور (اے نبی) ہم نے تم پر یہ یاد دہانی نازل کی ہے تا کہ تم کھول کر بیان کر دو لوگوں کے سامنے وہ چیز جو ان کے لئے نازل کی گئی اور تا کہ وہ غور کریں"۔

چنانچہ رسولِ ختمی مرتبت ﷺ نے اپنے قول و عمل سے قرآن حکیم کی تشریح و توضیح

نوع انسانی کے سامنے پیش فرمادی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے' اس کی حکمتِ بالغہ کے تقاضے کے طور پر' رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ اس تشریح و توضیح کو بھی قیامِ قیامت تک کے لئے محفوظ رکھے جانے کے انتظامات فرمادیئے گئے۔ حضور ﷺ نے قرآن میں مذکور سزاؤں کے علاوہ چند مزید سزائیں بھی نافذ فرمائیں' مثلاً شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا' ارتداد اور توہینِ رسالت کے مرتکب افراد کے لئے قتل کی سزا' اور شرابی کے لئے چالیس کوڑوں کی سزا۔ آنحضورؐ کی نافذ کردہ ان سزاؤں پر بھی تواتر کے ساتھ امّت کا اجماع چلا آرہا ہے' اس لئے کہ وحی جلی کی طرح وحی خفی بھی امت کے لئے حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

قرآن و سُنّت سے ثابت شدہ ان معیّن سزاؤں کو "حدود" کا نام دیا جاتا ہے اور نزولِ قرآن سے لے کر آج تک امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حدود غیر مبدّل اور ابدی ہیں اور یہ کہ کسی بھی زمانے میں عصری تقاضوں کے پیش نظر ان میں کسی تغیر و تبدیل کی گنجائش نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر ان حدود کے معاملے میں تاقیامِ قیامت کسی اجتہاد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عصرِ حاضر میں دینی علوم سے بے بہرہ' مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مغربی فکر و قانون سے مرعوب بعض نام نہاد دانشوران اسلامی حدود کے بارے میں بھی طرح طرح کی گل افشانیاں کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی ان سزاؤں کو (معاذاللہ) وحشیانہ اور غیر مہذّب کہا جاتا ہے' اور کبھی ان کے بارے میں یہ دُور کی کوڑی لائی جاتی ہے کہ ان سزاؤں کی حیثیت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے' بلکہ یہ اُس وقت کے عرب بدّوؤں کے لئے تھیں جو قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے اولین مخاطب تھے' اور یہ کہ دوسری اقوام اور بعد کے زمانوں کے لئے ان سزاؤں میں تغیر و تبدیل کی گنجائش ہے' لہٰذا عہدِ حاضر میں ان کے بارے میں اجتہاد کیا جانا چاہئے۔ بعض دانشور اپنے اس موقف کی تائید میں علامہ اقبال کے ایک خطبے کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں انہوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تصنیف "حجتہ اللہ البالغہ" سے ایک حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انبیاء جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے' لہٰذا ضروری نہیں کہ ان

احکامِ شرعیہ کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ یہ طرزِ استدلال چونکہ بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر گمراہی کی ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے، لہٰذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے خطبے کی عبارت اور اس میں بیان کردہ حجتہ اللہ البالغہ کی عبارت کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معاملہ نکھر کر سامنے آ سکے کہ غلط فہمی کی اصل بنیاد کیا ہے۔

علامہ اقبال کی "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامی" (The Reconstruction of Religious thought in Islam) کے چھٹے خطبے کا موضوع "اسلام کا حرکی تصور اور اجتہاد" (The Principle of Movement in the Structure of Islam) ہے۔ یہاں انہوں نے ذیلی بحث کے طور پر اسلامی قانون کے چار ماخذ یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر ان کے ضمن میں اپنے دور کے حالات کے پیدا کردہ مسائل کے حوالے سے تبصرہ کیا ہے۔ سنت کے ماخذِ قانون ہونے کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

"For our present purposes, however, we must distinguish traditions of a purely legal import from those which are of a non-legal character. With regard to the former, there arises a very important question as to how far they embody the pre-Islamic usage of Arabia which were in some cases left intact and in others modified by the Prophet is difficult to make this discovery, for our early writers do not always refer to pre-Islamic usages. Nor is it possible to discover that usages, left intact by express or tacit approval of the Prophet, were intended to be universal in their application. Shah Wali Allah has a very illuminating discussion on the point. I reproduce here the substance of his view. The Prophetic method of teaching, according to Shah Wali Allah, is that, generally speaking, the law revealed by a prophet takes especial notice of the habits, ways, and peculiarities of the people to whom he is specifically sent. The Prophet who aims at all-embracing principles, however, can neither reveal different principles for

different peoples, nor leaves them to work out their own rules of conduct. His method is to train one particular people, and to use them as a nucleus for the building up of a universal *Shari'ah*. In doing so he accentuates the principles underlying the social life of all mankind, and applies them to concrete cases in the light of the specific habits of the people immediately before him. The *Shari'ah* values (*Ahkam*) resulting from this application (e.g. rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and since their observance is not an end in itself they cannot be strictly enforced in the case of future generations". {4}

اس عبارت کا ترجمہ نذیر نیازی صاحب نے اس طرح کیا ہے :

"لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہئے ان احادیث کو جن کی حیثیت سرتاسر قانونی ہے' ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا' یا جس میں حضور رسالت مآب صلعم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی' کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا اکتشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا' کیونکہ علماء متقدمین شاذ ہی اس رسم و رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا' خواہ حضور رسالت مآب صلعم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی' اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا' شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں' اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جائیں گے' نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی

تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیاتِ اجتماعیہ میں کار فرما ہیں' پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اس قوم کے لئے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں' اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے"۔ {۸}

علامہ اقبال کا یہ اقتباس مندرجہ ذیل دو پہلوؤں سے قابل غور ہے :

i) کیا اسلامی سزاؤں سے متعلق شاہ ولی اللہؒ کا موقف واقعتاً یہی ہے جو مذکورہ بالا اقتباس سے متبادر ہوتا ہے' یا علامہ اقبال کو حجتہ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں کوئی تسامح ہوا ہے؟

ii) علامہ اقبال نے حجتہ اللہ البالغہ سے استدلال کرتے ہوئے جو نتیجہ اخذ کیا ہے' کیا یہ اقبال کا مستقل موقف تھا؟ اور اس کو بنیاد بنا کر کیا اسلامی حدود کے بارے میں یہ موقف کسی بھی درجے میں اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق عرب کے بدو معاشرے سے تھا اور آج کے "مہذب" معاشرے کے لئے ان کا نفاذ قابل عمل نہیں ہے؟

اس ضمن میں ہم اولاً پہلے نکتہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر حال ہی میں اقبال اکادمی کے نائب ناظم جناب محمد سہیل عمر کا ایک تحقیقی مضمون "سزا یا ناسزا" کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے {۹} جس میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس قابل قدر مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں شاہ ولی اللہؒ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ حجتہ اللہ البالغہ میں بایں طور مذکور نہیں ہے' بلکہ علامہ اقبال نے دراصل علامہ شبلی نعمانی پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی تالیف "الکلام" میں مندرج عبارت کو اپنے خطبے میں نقل کیا ہے' جبکہ حجتہ اللہ البالغہ کی اصل عبارت اور "الکلام" میں دی گئی عبارت میں بہت فرق ہے۔ محمد سہیل عمر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

".....یہاں آکر علامہ نے ایک نکتہ اٹھایا ہے اور وہ ہے احکام شرعی کے تعین میں اِلف وعادت اور عرف ورواج کی رعایت رکھنے کا معاملہ۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے علامہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف حجتہ اللہ البالغہ سے ایک حوالہ دیا ہے اور اس میں بیان کردہ فکری مقدمے پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔ تشکیل جدید کے متداول انگریزی ایڈیشن کی تصحیح متن اور تعلیقات نویسی جناب شیخ محمد سعید صاحب نے انجام دی ہے۔ ان کے تعلیقات کے وسیلے {۱۰} سے شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت کی جستجو کی گئی تو یہ بات پہلی مرتبہ سامنے آئی کہ حجتہ اللہ البالغہ کے مذکورہ صفحے پر اس مضمون کی کوئی متعلقہ عبارت موجود نہیں ہے۔ اس تعلیقہ میں عربی عبارت بھی دی گئی تھی اور الکلام میں اس کے اقتباس کا ذکر بھی تھا۔ الکلام کا متعلقہ صفحہ دیکھا گیا{۱۱} تو یہ کھلا کہ اقتباس کردہ عبارت اور تعلیقے کی عبارت میں فرق ہے۔ مزید پرچول کی تو شاہ صاحب کی اصل عبارت بھی مل گئی {۱۲}۔ الکلام میں دی گئی عبارت کو اصل عربی عبارت سے ملا کر دیکھا تو واضح ہوا کہ شبلی نے جو عبارت الکلام میں درج کی اور جسے علامہ نے اپنے استدلال کے لئے شبلی کے بھروسے پر بنیاد بنایا اس میں اور شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت میں اختلاف ہے۔ شبلی نے اپنے مخصوص انداز تالیف میں پہلے تو عبارت کے درمیان سے چھ سطریں حذف کردیں، پھر آخر کی دو سطریں اڑادیں اور اس کے بعد نہ صرف اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ عربی عبارت مسلسل نقل نہیں ہوئی بلکہ آخر میں استنباطِ نتائج کے طور پر جو اردو میں خلاصہ یا مقصودِ کلام دیا ہے وہ بھی اس طرح درج ہوا ہے کہ بظاہر شاہ صاحب ہی کا مدعا قرار پاتا ہے....."{۱۳}

زیر نظر مضمون جناب محمد سہیل عمر کی تحقیق سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے اور ان کے شکریئے کے ساتھ قارئین میثاق کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مسئلے کی وضاحت کے لئے پہلے ہم شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت ملاحظہ کرتے ہیں۔ متعلقہ عبارت حجتہ اللہ البالغہ کے مبحث سادس (مبحث السیاسات الملیۃ) کے "باب الحاجۃ الیٰ دین ینسخ الادیان" میں واقع ہوئی ہے۔ اس باب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت انسانیت ذہنی، روحانی اور

تمدنی ارتقاء کے حوالے سے اس سطح تک پہنچ چکی تھی کہ اب ایک ایسی شریعت نازل کر دی جاتی جو سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہوتی اور اب یہی شریعت قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہتی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جو شریعت نازل ہوئی وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ تاقیامت انسانوں کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ شریعت اسلامی میں یہ خوبی کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ناقابل تغیر اور قابل تغیر احکام کس حکمت کے ساتھ سموئے گئے ہیں اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں :

وهذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة یحتاج الی اصول اخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق۔ منها ان یدعو قوما الی السنة الراشدة' ویزکیهم' ویصلح شأنهم' ثم یتخذهم بمنزلة جوارحه' فیجاهد اهل الارض' ویفرقهم فی الآفاق' وهو قوله تعالی : ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ وذلک لان هذا الامام نفسه لایتاتی منه مجاهدة امم غیر محصورة' واذا کان کذلک وجب ان تکون مادة شریعته ماهو بمنزلة المذهب الطبیعی لاهل الاقالیم الصالحة عربهم وعجمهم' ثم ماعند قومه من العلم والارتفاقات' ویراعی فیه حالهم اکثر من غیرهم' ثم یحمل الناس جمیعًا علی اتباع تلک الشریعة لانه لاسبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم او الی ائمة کل عصر' اذلا یحصل منه فائدة التشریح اصلاً' ولا الی ان ینظر ماعند کل قوم' ویمارس کلامنهم' فیجعل لکل شریعة' اذالاحاطة بعاداتهم وما عندهم علی اختلاف بلدانهم وتباین ادیانهم کالممتنع' وقدعجز جمهور الرواة عن روایة شریعة واحدة' فما ظنک بشرائع مختلفة' والاکثر انه لایکون انقیاد

الآخرین الا بعد عدد ومدد لایطول عمرالنبی الیھا' کماوقع فی الشرائع الموجودۃ الآن فان الیھود والنصاریٰ والمسلمین ماآمن من اوائلھم الاجمع' ثم اصبحوا ظاھرین بعد ذٰلک' فلا احسن ولا ایسرمن ان یعتبر فی الشعائر والحدود والا رتفاقات عادۃ قومہ المبعوث فیھم' ولایضیّق کل التضییق علی الآخرین الذین یاتون بعد' ویبقی علیھم فی الجملۃ' والاولون یتیسرلھم الاخذ بتلک الشریعۃ بشھادۃ قلوبھم وعاداتھم' والآخرون یتیسرلھم ذلک بالرغبۃ فی سیر ائمۃ الملۃ والخلفاء' فانھا کالامر الطبیعی لکل قوم فی کل عصر قدیمًا اوحدیثًا.... {۱۴}

عبدالحق حقانی صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ کے اردو ترجمے "نعمۃ اللہ السابغۃ" میں مذکورہ بالا عبارت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے :

".....اس امام کو جو تمام فرقوں کو ایک مذہب پر جمع کرنا چاہتا ہے علاوہ ان اصول امامت کے جو پیشتر مذکور ہو چکے ہیں اور اصول کی بھی ضرورت پڑتی ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہ راست کی طرف بلائے' ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کی حالت کو درست کرے' پھر ان کو بمنزلہ اپنے اعضاء کے بنالے تا کہ ان کے ذریعے تمام عالم میں جہاد کرے اور ان کو دنیا میں پھیلادے۔ چنانچہ خدا کے اس قول میں یہی مراد ہے "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی تکمیل کے لئے پیدا کئے گئے ہو"۔ اور یہ اس لئے ہے کہ یہ امام خود تنہا بے شمار قوموں سے جہاد نہیں کر سکتا' اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا مادہ تمام معتدل اقالیم کے باشندوں کے لئے اور تمام عرب و عجم کے لئے بمنزلہ طبعی مذہب کے ہو۔ اس کے بعد وہ مادۂ شریعت اس کی قوم کے علم وارتفاقات کے موافق ہو اور اس میں بہ نسبت دوسروں کے اس کی قوم کی حالت کا زیادہ خیال رکھا گیا ہو۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کا حکم دیا جائے کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر

قوم کی حالت کو (خود) اسی کے سپرد کر دیا جائے یا ہر زمانہ کے اماموں پر اس کو چھوڑ دیں' اس لئے کہ اس سے شریعت مقررہ بے سود ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ہر ہر قوم کے حالات وعادات دیکھ کر ہر ایک کے لئے جداگانہ شریعت مقرر کی جائے' اس لئے کہ ان کی عادات اور ان کے حالات کا احاطہ کرنا باوجود ان کے شعر اور مذاہب کے اختلاف کے محال کے درجہ میں ہے' حالانکہ تمام نقل کرنے والے صرف ایک شریعت کے نقل کرنے میں عاجز آ گئے ہیں تو مختلف شرائع کی نسبت تم کیا خیال کر سکتے ہو۔ اور نیز اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدتِ دراز کے بعد دوسرے لوگ شریعت کے مطیع ہوتے ہیں جس کے لئے نبی کی عمر وفا نہیں کرتی۔ اس وقت کی موجودہ شریعتوں میں ایسا ہی ہوا ہے' یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے متقدمین میں سے ایک مختصر سی جماعت ہی ایمان لائی تھی' پھر اس کے بعد ان کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ تو اس سے زیادہ عمدہ اور آسان طریقہ نہیں ہے کہ شرائع' حدود اور تدابیر میں اسی قوم کی عادت کا اعتبار کیا جائے جس کی طرف رسول مبعوث ہوا ہے اور یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ امور بالکل تنگی کا باعث نہ ہوں گو کسی قدر ان پر تنگی رہے۔ متقدمین کے لئے تو اس شریعت کو قبول کرنا اپنی دلی شہادت اور اپنی عادات کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے اور متاخرین کے لئے اس شریعت کا اختیار کرنا اس مذہب کے ائمہ اور خلفاء کی سیرتوں میں رغبت رکھنے کی وجہ سے سہل ہو جاتا ہے' کیونکہ یہ امر ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں خواہ قدیم ہو یا جدید بمنزلہ امر طبعی کے ہے.....»{۱۵}

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کرنے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی عبارت کو شبلی نعمانی نے "الکلام" میں کس انداز سے پیش کیا ہے۔ حجتہ اللہ البالغہ کے مذکورہ اقتباس سے پہلے شبلی نے شاہ صاحب کی عبارت کا خلاصہ اردو میں بایں الفاظ درج کیا ہے :

"اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے' اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے' لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو' اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا' کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے نہ تمام

قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور ان کو محاسن اخلاق کا نمونہ بناتا ہے، یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہے اور اسی نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہوتے ہیں، تاہم خاص اس کی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔"{۱۶}

اس کے معابعد شبلی نعمانی نے شاہ صاحب کی تحریر سے اقتباس اس انداز سے پیش کیا ہے

"اس اصول کو شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

وھذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة یحتاج الی اصول اخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق منھا ان یدعو قوما الی السنة الراشدة ویزکیھم ویصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلة جوارحہ۔ وذلک لان ھذا الامام نفسہ لایتاتی منہ مجاھدة امم غیر محصورة واذا کان کذلک وجب ان تکون مادة شریعتہ ماھو بمنزلة المذھب الطبیعی لاھل الاقالیم الصالحة عربھم وعجمھم ثم ماعندقومہ من العلم الارتفاقات ویراعی فیہ حالھم اکثر من غیرھم ثم یحمل الناس جمیعا علی اتباع تلک الشریعة لانہ لاسبیل الی ان یفوض الامرالی کل قوم اوالی امة کل عصراذلا یحصل منہ فائدة التشریع اصلا ولا الی

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں حاجت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے، اس کی اصلاح کرتا ہے، اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے، اس لئے ضرور ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو، اس کے ساتھ خاص اس کی قوم کے عادات اور مسلّمات کے اصول بھی لئے جائیں اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم یا ہر پیشوائے قوم کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں ورنہ تشریح محض بے فائدہ

ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومه المبعوث فیهم ولا یضیق کل التضییق علی الآخرین الذین یاتون بعد

ہوگی' نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا تجسس کیا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار' تعزیرات' اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے' اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعت اسلامی میں چوری' زنا' قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔»{۱۷}

حجتہ اللہ البالغہ کی اصل عبارت اور الکلام میں اقتباس شدہ عبارت کے متن میں تقابل کر کے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شبلی مرحوم نے شاہ صاحب کی عبارت کو اپنی مرضی کے معانی پہنانے اور اس سے اپنا من پسند مفہوم نکالنے کے لئے کس طرح حسب ضرورت کتر بیونت سے کام لیا ہے اور اصل عبارت سے جابجا فقرے حذف کر کے اسے کس طرح مسلسل عبارت کی شکل دے دی ہے۔ ان میں سے بعض (حذف شدہ) فقرے اس قدر اہم ہیں کہ عبارت میں ان کے ہونے یا نہ ہونے سے استدلال کا سارا تناظر بدل جاتا ہے۔ اس ضمن میں حجتہ اللہ البالغہ کی اصل عبارت کا آخری حصہ بہت اہم ہے۔ اس کا ایک رواں اور بامحاورہ ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے :

"..... چنانچہ اس سے بہتر اور آسان تر کوئی بات نہیں کہ شعائر' حدود اور ارتفاقات میں اسی قوم کی عادت کا اعتبار کیا جائے جس میں وہ مبعوث ہوا ہے اور بعد میں آنے والے دوسرے لوگوں کے لئے بالکل ہی تنگی نہ کر دی جائے۔ ان کے لئے ان (شعائر' حدود اور ارتفاقات) کو فی الجملہ باقی رکھا جائے۔ پہلے لوگوں کے لئے اس شریعت کو اختیار کرنا اس لئے آسان ہوا کہ ان کے دل اور ان کی عادات اس کے شاہد تھے۔ پچھلوں کے لئے اس کو اختیار کرنے میں آسانی اس

لئے ہو گئی کہ ان کے لئے ائمہ ملت اور خلفاء کی سیرت کا اتباع مرغوب چیز تھا۔ پس یہ شریعت ہر قوم کے لئے اور قدیم و جدید ہر زمانے میں امر طبیعی کی طرح ہے۔" {۱۸}

جبکہ اسی عبارت کو حسب ضرورت کترپیونت کے بعد شبلی نے یہ صورت دی ہے :

".....اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار' تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے' اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے"۔

یہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا! شاہ صاحب کی عبارت سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ احکامِ شریعت ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے واجب العمل ہیں اور ان پر عمل کرنا بعد والوں کے لئے بھی اتنا ہی آسان ہے جتنا پہلے والوں کے لئے تھا' البتہ اس آسانی کے اسباب دونوں کے لئے مختلف ہیں۔ معلوم نہیں کہ شبلی نعمانی جیسے صاحبِ علم نے کہاں پہ ٹھوکر کھائی کہ اسی عبارت کی کوکھ سے ایک بالعکس مفہوم کی حامل عبارت نکال لے آئے اور اس کی تمہید اور استنباطِ نتائج کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ

"جو احکام ان عادات و حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے"۔

اور

"اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعت اسلامی میں چوری' قتل' زنا وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے؟"

ہمیں تو یہ صورت حال علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق نظر آتی ہے ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!

اب ہم واپس علامہ اقبال کے محولہ بالا خطبے کی طرف آتے ہیں۔ حجتہ اللہ البالغہ کی

اصل عبارت اور الکلام میں اقتباس شدہ عبارت میں تقابل کے بعد یہ نتیجہ بھی بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کو اپنے خطبے میں حجتہ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں یہ تسامح ہوا ہے کہ انہوں نے شبلی پر اعتماد کرتے ہوئے الکلام میں مندرج عبارت کو حجتہ اللہ البالغہ کی اصل عبارت سمجھتے ہوئے نقل کر دیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اقبال نے اس وقت تک حجتہ اللہ البالغہ کی اصل عبارت ملاحظہ نہیں کی تھی' ورنہ انہیں شبلی کے فراہم کردہ اقتباس پر انحصار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ شبلی کے خلاصۂ افکار سے تاثر قبول نہ کرتے۔

جیسا کہ حجتہ اللہ البالغہ کی مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہے' اسلامی سزاؤں کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے جو ان سے الکلام میں منسوب کیا گیا ہے۔ مسئلے کی مزید وضاحت کے لئے حجتہ اللہ البالغہ جلد دوم کے باب الحدود سے شرعی سزاؤں کے بارے میں شاہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو :

واعلم انه كان من شريعة من قبلنا القصاص فى القتل والرجم فى الزنا والقطع فى السرقة' فهذه الثلاث كانت متوارثة فى الشرائع السماوية واطبق عليها جماهير الانبياء والامم' ومثل هذا يجب ان يؤخذ عليه بالنواجذ ولا يترك.....

"اور واضح ہو کہ سابقہ شریعتوں میں قتل کی سزا میں قصاص اور زنا کی سزا میں سنگسار کرنا اور چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا تھا۔ پس یہ تینوں سزائیں آسمانی شریعتوں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھیں اور تمام انبیاء اور ان کی امتیں اس پر متفق تھیں۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو نہایت مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے اور کبھی ان کو ترک نہیں کرنا چاہئے...."{19}

اس کے بعد شاہ صاحب نے ان سزاؤں کے بارے میں شریعتِ محمدیہؐ کا یہ تصرف بیان کیا ہے کہ اس شریعت میں ہر ایک سزا کے' تخفیف کے طور پر' دو درجے مقرر کئے گئے ہیں' جیسے قتل کی سزا میں قصاص کے علاوہ دیت اور زنا کی سزا میں رجم کے علاوہ کوڑے مارنا ہے۔ حدود کی بحث میں شاہ صاحب نے قتل' زنا' چوری' رہزنی' شراب

خوری اور قذف کا ذکر کیا ہے اور ان جرائم کی سخت سزاؤں کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔

مندرجہ بالا معروضات کے بعد اب ہم علامہ اقبال کے خطبے کا اس پہلو سے جائزہ لیتے ہیں کہ شرعی سزاؤں کے بارے میں اس میں جس نقطہ نظر کا اظہار کیا گیا ہے، کیا اس ضمن میں اقبال کا مستقل موقف یہی تھا؟

علامہ اقبال کا متذکرہ بالا خطبہ اپنی اولین شکل میں ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ تصنیف ہوا تھا اور موجودہ شکل میں ۱۹۲۸ء میں تیار کیا گیا۔ علامہ اپنی وفات (۱۹۳۸ء) سے قبل اس خطبے پر نظر ثانی نہ کر سکے، اگرچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دوران انہیں اپنے اس تسامح کا احساس ہو گیا تھا جو ان سے حجتہ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں ہوا، اور نتیجتاً ان کے افکار و نظریات میں تبدیلی آچکی تھی۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی صاحب سے علامہ اقبال کی مکاتبت کا وہ حصہ جو حیدر آباد دکن میں خطبات پیش کرنے کے بعد کا ہے، اس میں تخصیص کے ساتھ شبلی کی تحریر اور شاہ صاحب کے اقتباسات کے بارے میں استفسارات موجود ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو حجتہ اللہ البالغہ کی اس تشریح کے بارے میں تحیّر ہے جو شبلی نے پیش کی اور اس کے وہ مضمرات ان کے سامنے عیاں ہیں جو اسے قبول کرنے سے ظاہر ہو سکتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ستمبر ۱۹۲۹ء کے بعض خطوط میں اقبال نے الکلام کے اسی اقتباس پر خلش کا اظہار کیا ہے جو تشکیل جدید میں نقل ہوا ہے اور جسے شاہ ولی اللہ کا موقف قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ ان خطوط کے مطالعہ سے علامہ اقبال کے موقف کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تاہم ان سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کے اواخر تک علامہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاید شبلی نے شاہ صاحب کے مقصود کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور اس لئے شاہ صاحب کے اصل موقف کے تعین کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان خطوط سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اقبال نے حجتہ اللہ البالغہ کا مطالعہ ۱۹۲۹ء کے اواخر ہی میں کیا تھا اور قبل ازیں اپنے خطبے میں اس کی عبارت کا حوالہ "الکلام" میں مندرج عبارت ہی سے دیا تھا۔ البتہ سید سلمان ندوی کے نام ۱۹۳۴ء کے ایک خط سے کسی حد تک یہ غالب گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں اقبال کے موقف میں تبدیلی آچکی تھی۔ اپنے

۲۴/جنوری ۱۹۳۴ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"میں نے آپ کا پہلا خط پھر دیکھا ہے' آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے' مگر میں ان معاملات کی ایک فہرست چاہتا ہوں جن کے متعلق رائے قائم کرنا "امام" کے سپرد ہے۔ جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر غالباً قرآن شریف میں مقرر ہے' ان کے متعلق امام کیوں کر رائے دے سکتا ہے؟"{۲۰}

بہرحال علامہ اقبال کے اس خط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم میں مذکور جرائم کی سزاؤں کے بارے میں ان کا موقف یہی تھا کہ ان کی حیثیت ابدی ہے اور زمانے کے تغیر و تبدل کے ساتھ ان میں تغیر و تبدیل ممکن نہیں۔ گویا یہ دائرۂ اجتہاد سے ماوراء ہیں۔

موضوع زیر بحث سے متعلق ڈاکٹر محمد امین صاحب کا ایک مضمون بھی "شاہ ولی اللہ اور اسلامی حدود" کے عنوان سے سہ ماہی فکر و نظر میں شائع ہوا ہے جس میں یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ شاہ صاحب کی عبارت نقل کرنے میں اپنے تسامح کے باوجود اس میں وارد شدہ لفظ "الحدود" کو علامہ اقبال نے غالباً شرعی اور اصطلاحی حدود کے مفہوم میں نہیں لیا۔ اقبال نے "حدود" کا ترجمہ "*Shariah Values*" کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی قوسین میں (e.g. rules relating to penalties for crimes) یعنی "مثلاً جرائم کی سزاؤں سے متعلق احکام" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"یہاں اگر "جرائم کی سزاؤں سے متعلق احکام" سے مراد تعزیری احکام ہیں' جیسا کہ اس کا ترجمہ نذیر نیازی صاحب نے کیا ہے' تو یہ بالکل صحیح ہے' کیونکہ تعزیری احکام کی تفصیلات میں زمان و مکان کے بدلنے سے تغیر کا واقع ہونا ایک امر ظاہر ہے' لیکن اگر اس سے مقصود اصطلاحی حدود ہیں تو اس پر وہی اعتراض وارد ہو گا جو اس سے پہلے ہم علامہ شبلی کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ اقبال نے یہاں حدود کا لفظ استعمال نہیں کیا اس لئے اسلامی حدود کا لفظ خوامخواہ اقبال کے سر کیوں منڈھا جائے؟"{۲۱}

واضح رہے کہ شبلی نے الکلام میں "حدود" کا ترجمہ "تعزیرات" کرنے کے باوجود اس

سے مراد شرعی اور اصطلاحی حدود ہی ہیں۔

دورِ حاضر کے جو نام نہاد دانشور اسلامی حدود و تعزیرات کو عرب کے بدو معاشرے کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں اور انہیں وحشیانہ قرار دے کر موجودہ "مہذب" معاشرے کے لئے ناممکن العمل قرار دیتے ہیں ان کے افکار و نظریات درحقیقت دین سے محض ناواقفیت ہی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اسلام دشمنی کا مظہر ہیں۔ مغربی تہذیب و ثقافت کے دلدادہ اور مغربی افکار سے مرعوب یہ کج فہم اور دریدہ دہن لوگ اپنے خود ساختہ نظریات کے پرچار کے لئے علامہ اقبال کا نام بھی استعمال کرتے ہیں، حالانکہ مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال احکامِ شریعت میں ردّوبدل کے قائل نہیں تھے اور ایک دور میں ان کے قلم سے اگر اس سے فروتر کوئی بات نکل گئی تھی تو وہ محض غلط فہمی پر مبنی تھی، جس سے انہوں نے بعد میں رجوع کر لیا تھا۔

حواشی

(۱) سورۃ المائدہ، آیت ۵۔
(۲) سورۃ المائدہ، آیت ۳۸۔
(۳) سورۃ المائدہ، آیت ۳۳۔
(۴) سورۃ البقرۃ، آیت ۱۷۸۔
(۵) سورۃ النور، آیت ۲۔
(۶) سورۃ النور، آیت ۴۔
(۷) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی) تدوین و تعلیقات از شیخ محمد سعید، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان و ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۱۳۶۔
(۸) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ نذیر نیازی، مطبوعہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع سوم مئی ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۴۔۲۶۶
(۹) اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، جلد ۲۶، شمارہ ۴، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۷۰۱۔۱۳۷
(۱۰) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی)، محولہ ماقبل، ص ۱۹۶
(۱۱) شبلی نعمانی، الکلام مشمولہ علم الکلام اور الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۳۷۔۲۳۸
(۱۲) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ ج ۱، ص ۱۱۸

(۱۳) اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۰۷

(۱۴) حجتہ اللہ البالغہ، محولہ ماقبل، ج ۱، ص ۱۱۸

(۱۵) حجتہ اللہ البالغہ، مع اردو ترجمہ نعمۃ اللّٰہ السابغہ، مترجم ابو محمد عبدالحق حقانی، نور محمد اصح المطابع، کراچی، (۱۳۰۲ھ)، ج ۱، ص ۲۵۴۔۲۵۵

(۱۶) شبلی نعمانی، الکلام، محولہ ماقبل، ص ۲۳۶

(۱۷) شبلی نعمانی، الکلام، محولہ بالا، ص ۲۳۷۔۲۳۸

واضح رہے کہ حجتہ اللہ البالغہ سے جو ادھوری عبارت "الکلام" میں نقل کی گئی ہے اس میں بھی کئی جگہ سہو کتابت موجود ہے، لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۸) اصل عبارت کے لئے دیکھئے حجتہ اللہ البالغہ، محولہ ماقبل، ج ۱، ص ۱۱۸

ترجمہ عبارت از محمد سہیل عمر، اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۱۴

(۱۹) حجتہ اللہ البالغہ، مع اردو ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ، محولہ ماقبل، ج ۲، ص ۴۵۰

(۲۰) اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۲۵

(۲۱) سہ ماہی فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، جلد ۳۲، شمارہ ۲، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۷۰

ضرورت رشتہ

شادمان میں سرکاری رہائش میں مقیم وزارت دفاع کے ایک گزیٹڈ آفیسر کو دوسری شادی کے لئے (اولاد نہ ہونے کی وجہ سے) دینی مزاج کے حامل گھرانے سے نیک سیرت شرعی پردہ دار اور تعلیم یافتہ خاتون کار شتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ : محمد عطاء اللہ صدیقی، شاف ٹریننگ انسٹیٹیوٹ 85۔شاہ جمال، لاہور

فون آفس : 7589547-7581710 رہائش : 5166954

☆ ☆ ☆

امور خانہ داری کی ماہر، پابند صوم و صلوٰۃ، تعلیم یافتہ بچی کے لئے دینی گھرانے سے برسرروزگار نوجوان کار شتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ : حافظ خالد محمود خضر، K۔36 ماڈل ٹاؤن لاہور

نفاق کی نشانیاں(۵)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی
ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

بیسویں نشانی

حادثاتِ زمانہ سے خوامخواہ ڈرنا

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ (المنافقون : ۴)

"وہ ہر زور کی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں"۔

وہ ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں' اگر قیمتیں چڑھ جائیں تو محفلوں میں بیٹھ کر واویلا کرتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے سنا ہے کہ چاول اور چینی کا نرخ کس قدر بڑھ گیا ہے؟۔ بس انہیں تو کھانے پینے کا خیال ہے' انہیں دعوتِ دین یا نصرتِ اسلام کی قطعاً فکر نہیں' اور نہ ہی انہیں غلط کاموں کو ختم کرنے کی فکر ہے اور نہ ہی امر بالمعروف و النہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کا خیال ہے۔ ان کی ساری سوچ تو مارکیٹ کے ریٹوں' درختوں' خبروں' بارشوں' رات کو کھلی رہنے والی ڈسپنسریوں اور زمینی درجۂ حرارت کے اردگرد گھومتی ہے ان کا سارا دین ہی یہی ہے۔ دنیاوی آسائشیں ان کا مقصدِ حیات ہے۔ بعض لوگ تو اسی دعا میں مصروف رہتے ہیں کہ اے اللہ' کہیں ہمارے یہ اچھے حالات نہ بدل جائیں اور ان میں کوئی ردّوبدل نہ ہو جائے۔ اگر تم معلوم کرو کہ کس نعمت کی بات کرتے ہو؟ تو وہ کہے گا آج کل بینگن بہت سستا ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں کھیرے اور سبزی و ترکاری میں نعمت والی بات ہے اور اس دین کی شکل میں موجود اللہ کی ازلی و ابدی نعمت کو وہ بھول چکے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں :

﴿ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ

اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الحجرات : ۱۷)

"یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا' ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو' بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہو"۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾ (یونس : ۵۸)

"اے نبی کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز (نصیحتِ خداوندی) اس نے بھیجی' اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں"۔

لہٰذا ہونا تو یہ چاہئے کہ یہ لوگ دین' رسالت' مساجد' قرآن کریم' سنّتِ مطہرہ' سیرتِ طیبہ' علماء کے وجود اور داعی حضرات کو پاکر خوش ہوں۔ رہا اس دنیا کا معاملہ تو کافر ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ تم اگر پختہ مکان میں رہ رہے ہو تو کافر فلک بوس عالی شان بلڈنگوں میں رہ رہے ہیں' تم اگر ایک عام گاڑی میں سوار ہو سکتے ہو تو کافر اپنے ہی ملک میں بنی ہوئی عالی شان گاڑیوں میں سواری کر رہے ہیں۔ موجودہ ترقی کی صورت حال کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

> "ہم نے کافروں سے آلاتِ موسیقی اور سگریٹ تو لے لیا ہے' البتہ گاڑی بنانی نہیں سیکھی۔ جب ہم سو رہے تھے وہ لوگ ہمت سے جاگ گئے۔ اور جب ہمیں ہوش آیا تب تک وہ لوگ فضاؤں میں پہنچ چکے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کس خوبصورتی سے حقیقتِ حال کا نقشہ کھینچ رہا ہے :

﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (الزخرف : ۳۳-۳۵)

"اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے، یہ تو محض حیاتِ دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لئے ہے"۔

اسی لئے ان کے خیال میں صرف کھانے پینے کا نام ہی نعمت ہے۔ بلاشبہ یہ نعمت ہے بشرطیکہ یہ وسائلِ زندگی اطاعتِ خداوندی کے معاون بنیں۔ البتہ اگر ان نعمتوں میں پلنے والا نماز چھوڑ بیٹھے، گھر میں اسلامی ماحول نہ رکھے، پردے کا خیال نہ رہے، موسیقی سے اپنے آپ کو نہ بچائے، مسلمانوں کی پردہ داری اس کے ہاتھوں چاک ہو، پھر اچھا کھانا پینا نعمت کہاں رہے؟ ڈھور ڈنگر بھی کھاتے پیتے ہیں لیکن نعمتِ ایمان سے محروم! اسی لئے تم منافقوں کو دیکھو گے کہ ناگہانی حادثات سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر فلپائن کے اندر بھی آتش فشاں پھٹے تو گھبرا جاتے ہیں، اور ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں ---- اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر کہتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے، ہم سب اکٹھے ہی مرجائیں گے۔

ان کے برعکس مومن کا معاملہ یہ ہے کہ جان کو ہتھیلی پر رکھے رہتا ہے، شاعر نے کہا ہے :

"اے ہمارے رب ہماری جان ہماری ہتھیلی پر ہے۔ کامیابی اور جہنم سے نجات کی امید کے ساتھ تیرے حضور پیش ہونا چاہتی ہے"۔

کیونکہ مومن نے تو اپنی جان پہلے ہی اللہ کے ہاتھ فروخت کر رکھی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ.....۝﴾ (التوبہ : ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں....."

اسی کا نتیجہ تھا کہ صادق اور مخلص صحابہ کا حال یہ تھا کہ تلواریں سونتی ہوئی ہیں،

جانیں ہتھیلیوں پر رکھی ہوئی ہیں اور دورانِ جنگ قہقہے لگ رہے ہیں۔ اور اُدھر منافق کا حال یہ ہے کہ جنگ ہزار کلو میٹر پر لڑی جا رہی ہے اور وہ خوف کے مارے کانپ رہا ہے اور جان حلق میں پھنسی ہوئی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ بزدلی اور ناگہانی حادثات سے ڈرنا منافق کی پہچان ہے، وہ ہمیشہ ڈگمگایا رہتا ہے، بس پر سکون زندگی کا طلبگار ہے۔ وہ کہتا ہے ہمیں مت چھیڑو، ہمیں چھوڑ دو، شاید اللہ تعالیٰ اس نعمت کو ہم پر اسی طرح برقرار رکھے، ہمارا اپنا حال بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ حالانکہ اس کا حال سب سے قابلِ ترس ہوتا ہے۔

اکیسویں نشانی

جھوٹ موٹ کا عذر تراشنا

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جَد بن قیس سے کہا کہ جہاد کی خاطر ہمارے ساتھ چلو۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ میں آزمائش سے ڈرنے والا آدمی ہوں، مجھے اپنے کانوں اور آنکھوں کی طرف سے خطرہ ہے ۔ اللہ اکبر! کس قدر خوفِ خدا کا مالک ہے!! امام ابن تیمیہ کہتے ہیں: "بے روح اور بے جان تقویٰ اسی کو کہتے ہیں۔" بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب تم فرعون کے متعلق بات کرو تو کہتے ہیں: استغفراللہ، نیک لوگوں کی غیبت نہ کرو، اور اگر تم ابلیس کا نام لو تو کہتے ہیں: اللہ کے ولیوں کے بارے میں ہم کوئی بری بات کرنے کو تیار نہیں۔ کتاب الحمقیٰ میں امام ابن الجوزی نے اس طرح کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی کے سامنے فرعون کا تذکرہ ہوا، اس نے کہا میں اپنے آپ کو اور اپنے کانوں کو اللہ کے نبیوں کے بارے میں بات کرنے سے بچاتا ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ فرعون بھی کوئی اللہ کا نبی تھا۔ یہ ہے بے روح تقوٰے کی شکل۔ جَد بن قیس جیسے منافق نے غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں اس فطرت کا آدمی ہوں کہ جب بنی اصفر کی لڑکیاں دیکھ لیتا ہوں تو اپنی ذات پر فتنے کا خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ اس کی بات کو بظاہر صحیح سمجھتے ہوئے آپ ﷺ نے اس کا اعتبار کر لیا اور ادھر اللہ تعالیٰ نے اس کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا۔ فرمایا:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ' اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ' وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ○ ﴾ (التوبہ : ۴۹)

"ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے۔ سن رکھو فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے"۔

یہی منافق صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنا گمشدہ اونٹ تلاش کرتے ہوئے آیا۔ صحابہ نے کہا : ادھر آؤ' رسول اللہ ﷺ تمہارے حق میں مغفرت کی دعا کر دیتے ہیں۔ اس نے جواب دیا : مجھے میرا سرخ اونٹ مل جائے' میرے نزدیک محمد کی دعاءِ مغفرت سے یہ زیادہ بہتر ہے (ونعوذ باللہ)۔ صحابہ کرام نے جب یہ بات اصرار کے ساتھ کہی تو وہ عناد و تکبر سے سر جھٹک گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ (المنافقون : ۵-۶)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لئے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبی تم چاہے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لئے یکساں ہے۔ اللہ ہرگز انہیں معاف نہیں کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے کہ قطعاً ان کی بخشش نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا :

﴿ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾

(التوبہ : ۸۰)

"اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : اگر مجھے علم ہو کہ ستر مرتبہ سے بھی زیادہ استغفار پر ان کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں ضرور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کر دوں۔

بائیسویں نشانی

برائی کا حکم دینا اور اچھائی سے روکنا

منافقین سے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں"۔

چنانچہ لوگ جس قبلہ کی طرف منہ کریں یہ اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب تم اللہ اور رسول کی بات انہیں سنانا شروع کرو' تو وہ کہتے ہیں : بھائی صاحب ہمیں معاف رکھو' ہمیں آرام سے رہنے دو' ہمیں دین کا خوب علم ہے' ہمیں دین کی تم سے زیادہ سمجھ ہے' الحمدللہ دین اور علم خوب پھیل چکا ہے' نیشاپور کی بوڑھی عورتیں بھی علم جانتی ہیں' حتیٰ کہ گدھے بھی تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں ---- لیکن اگر تم سجدۂ سہو کا مسئلہ پوچھ لو تو چٹا جاہل ثابت ہو گا اور اسے دین کے کسی مسئلے کا علم نہیں ہو گا۔ منافقوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی فہم و فراست کی کمی ہے' جس کا تذکرہ عنقریب آ رہا ہے۔

وہ برائی کا حکم دیتے ہیں' بھلائی سے منع کرتے ہیں۔ ان کا پروگرام یہی ہوتا ہے کہ برائی اہل ایمان میں پھلے پھولے اور پردہ ختم ہو جائے۔ کچھ مؤلفین و مصنفین نعرہ لگا رہے ہیں کہ عورت کو آزادی ملے' وہ پردے سے باہر نکلے' گانے اور فحش رسالے عام ہوں' نشہ آور چیزوں کا رواج ہو۔ یہ سب کا سب برائی کا حکم ہے اور بدی سے محبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی نیکی اور بھلائی کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا پروگرام ہے کہ خیر کی قوت کمزور ہو' علم ناپید ہو اور دعوتِ دین کا کام ٹھپ ہو جائے ---- اللہ ہی ان کو سنبھالے۔

تیئیسویں نشانی

کنجوسی کرنا

امورِ دین اور نیکی کے معاملات میں خرچ کرنے کے سلسلے میں منافق لوگ سب سے زیادہ بخیل ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ نام اور شہرت کی خاطر تو ایک ہی ولیمہ پر ساٹھ ساٹھ بکرے ذبح کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے 'مسجد کی تعمیر یا جہاد کی خاطر تعاون کا کہہ دیا تو دس روپے نکال کر انہیں گنے گا' ہاتھوں میں مسلے گا' اس کی قبولیت کی دعا کرے گا' اور ان کے بدلے جنت کی دائیں جانب سفید محل کی امید کرے گا۔ منافقین انتہائی تنگ دلی کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حال ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :

﴿ اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ ' يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ' نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا"۔

ایسے لوگ قدرت رکھنے کے باوجود بھی نیکی کے کاموں میں خرچ نہیں کرتے اور ہمیشہ ہاتھ روک کر رکھتے ہیں۔ نفاق کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی یہ ہے۔ وَالعیاذ باللّٰہ۔

چوبیسویں نشانی

اللہ کو بھلا دینا

اللہ کے علاوہ ہر چیز اسے یاد رہتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ ہر چیز کو یاد رکھتا ہے۔ بیوی کو' بچوں کو' گانوں کو' اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو حتیٰ کہ دنیا کی ہر چیز اسے یاد ہے' بس

نہیں آتی تو اللہ کی یاد نہیں آتی' یا بس کہیں بھولے بھٹکے انداز میں اس کے دل پر اللہ کا گزر ہو جاتا ہے' کیونکہ اس کا دل مرچکا ہے۔ شاعر نے کہا ہے :

"جو دوسروں کو بے وقعت کرے اس کے لئے بے عزتی برداشت کرنا آسان ہے
اور کسی مُردے کے زخموں کا اندمال نہیں ہوا کرتا ہے۔"

اللہ کو بھول جانا منافقوں کی سب سے بڑی کوتاہی اور غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"یہ منافق لوگ اللہ کو بھولے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَاَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾

(المجادلہ : ١٩)

"شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دلوں سے بھلا دی ہے"۔

احیاء العلوم کے مصنف امام الغزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : جو آدمی کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اس کا تذکرہ بار بار کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اگر مختلف کاموں کے کاریگر اور فنکار ایک گھر میں داخل ہوں تو ہر آدمی اپنے اپنے کام کا تذکرہ کرے گا اور اپنے اپنے کام سے متعلق چیزوں کو غور سے دیکھے گا' اس کا ذکر اس کی زبان پر ہو گا' ایک بڑھئی جب گھر میں داخل ہو گا تو کھڑکیوں اور دروازوں کو غور سے دیکھے گا اور جب رنگ ساز داخل ہو گا تو قلعی اور رنگوں پر غور کرے گا اور جولاہا اور قالین فروش زمین پر دیکھے گا۔ یعنی ہر ایک ہمیشہ اپنے اپنے فن اور پیشے کی بات کرے گا۔ اور اللہ سے محبت کرنے والا اللہ ہی کا بار بار نام لے گا۔ البتہ منافق کو اللہ کے ذکر سے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے ان کے تذکرے سے سخت غصہ اور بغض آتا ہے' لہٰذا شاذ ہی اللہ کا نام اس کی زبان پر آئے گا۔ جب وہ اللہ کو بھول گیا ہے تو اللہ نے بھی اسے بھلا دیا ہے' یعنی چھوڑ دیا ہے۔

تہذیب الاطفال

(تیسری قسط)☆

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

ولادت سے رضاعت تک

تہذیب الاطفال کے ضمن میں ہم اختصار کے ساتھ ولادت سے رضاعت تک کے دور کو تقریباً مکمل کر چکے ہیں' لیکن ایک آخری بات جو کہ انتہائی ضروری تھی' اس کا ذکر وہاں نہیں ہو سکا۔ وہ یہ ہے کہ عام طور پر خواتین جب نماز پڑھتی ہیں تو اپنے شیر خوار بچوں کو ایک طرف ڈال دیتی ہیں' خود نماز میں مصروف ہوتی ہیں اور بچہ چیخ وپکار کر رہا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ نیکی کا کام سمجھا جاتا ہے اور تقویٰ کا عمدہ معیار' کہ ماں کا دل نماز میں اس قدر لگا ہوا ہے کہ بچے کی بھی پروا نہیں کر رہی' جبکہ درحقیقت چاہے ماؤں کا نماز میں دھیان ہی نہ ہو۔ آیئے یہاں بھی ہم نبی اکرم ﷺ کی ذاتی رہنمائی سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ حضرت ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی نواسی کو اٹھا کر نماز پڑھی (جو کہ حضرت زینبؓ کی بیٹی تھیں) آپؐ کھڑے ہوتے تو ان کو گود میں اٹھا لیتے اور سجدے میں جاتے تو اپنے پاس بٹھا لیتے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لینے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچے کے شعور اور اس کی بنیادوں میں خدائے پاک کی عبادت اور عظمت کا شعور اور شوق خود بخود پیدا ہو' کیونکہ جب بچہ ماں سے سب کچھ سیکھتا ہے تو نماز کی حرکات و سکنات سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھے گا۔ آپ اسے پیار سے بٹھائیں گی تو شوق سے آپ کو دیکھے گا اور اگر مار پیٹ کر ایک طرف کر دیں گی تو آپ جونہی جائے نماز پر کھڑی ہوں گی بچہ نہ صرف چیخ وپکار شروع کر دے گا بلکہ اسے نماز سے نفرت ہونا شروع ہو جائے گی۔

☆ مضمون کے تسلسل کے لئے دوسری قسط دسمبر ۹۵ء کے میثاق میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری بات یہ کہ مسجد میں یا کسی دینی محفل وغیرہ میں اگر آپ خود نماز کی نیت باندھ لیتی ہیں اور بچہ رونا شروع کر دیتا ہے تو باقی تمام خواتین کی نماز بے حد خراب ہونے کا خطرہ ہے جو کہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام خواتین کی نماز خراب ہونے کی ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ اگر ہم بچوں والیاں اگلی صفوں میں کھڑے ہونے کی بجائے آخری صفوں میں کھڑی ہوں اور نبی اکرم ﷺ کے عمل کے مطابق رونے والے بچوں کو اپنے پاس لے کر کھڑی ہوں تو نہ صرف یہ کہ آپ سمیت سب کی نماز احسن طریقے سے پڑھی جائے گی بلکہ سنتِ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے آپ اضافی ثواب بھی کمالیں گی۔ ان شاء اللہ۔

ایک مزید بات یہ کہ بچے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے ہیں تو مائیں نماز سے غافل ہو جاتی ہیں کہ کپڑے ناپاک تھے 'کیا کریں۔ گھر میں بھی جگہ جگہ ناپاکی پھیلی ہوتی ہے۔ یہ بات انتہائی غور طلب ہے کہ ہم بچوں کی آڑ میں دو بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک تو گھر میں ناپاکی پھیلتی ہے۔ پیشاب چاہے بچے کا ہی ہو بالکل ناپاک ہے (اِلّا یہ کہ تین ماہ کی عمر تک کے بچے کا اور وہ بھی صرف لڑکے کا' جس پر کہ تین دفعہ پانی کا ہاتھ پھیر لینے سے کسی حد تک پاکی حاصل ہو جاتی ہے) اور حدیث میں ہے کہ پیشاب کے چھینٹوں کی وجہ سے کئی لوگوں کو قبر میں عذاب ہوتا نبی اکرم ﷺ نے خود سنا ہے اور صحابہ کرامؓ کو بتایا ہے۔ تو ایک تو یہ اتنی بڑی سزا صرف پیشاب سے بداحتیاطی کی وجہ سے اور دوسری بات یہ کہ نماز سے غفلت۔ بچے کے پیشاب کا بہانہ کر کے فرض نماز چھوڑ دینا کیا ہمیں کسی قسم کا بھی کوئی فائدہ دے سکے گا۔ صرف اپنی سستی اور غفلت اور آسانی کو اپنا کر ہم کتنے بڑے نقصان کا سودا کر لیتے ہیں کہ نہ صرف قبر میں ناپاکی کی وجہ سے عذاب بلکہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے قبر میں اور روز قیامت سخت ترین رسوائی اور ذلت کا سامنا۔ تو میری گزارش ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے گھر کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کریں بلکہ اپنے آپ کو بھی حتی الامکان پیشاب کے چھینٹوں سے بچائیں۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی لیکن اللہ سے اجر کی امیدوار رہیں اور "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" والی آیت اور "الطهارةُ من الايمان" والی حدیث مبارکہ ذہن میں رکھیں تو ان شاء اللہ ایک

ایک عمل جو آپ اس ضمن میں کریں گی وہ باعث اجر و ثواب ہو گا۔

تین سے سات سال تک

ولادت سے رضاعت کے بعد اب تین سال سے سات سال تک کی عمر میں ہمیں جو رہنمائی نبی اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے ملتی ہے اسے مختصراً دیکھتے ہیں۔ بچے کی تین سال کی عمر بہت پیاری بھی ہوتی ہے اور سیکھنے کے اعتبار سے انتہائی نازک بھی ہوتی ہے۔ بچے بولنا سیکھتے ہیں، نئی نئی حرکتیں سیکھتے ہیں تو ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا بہت پیاری لگتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اِذَا اَفْصَحُوا اَوْلَادَکُم فَعَلِّمُوھُنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کہ جب تمہارے بچے بولنا سیکھیں تو ان کو لا الٰہ الا اللہ سکھاؤ۔

افسوس ہوتا ہے ہم مسلمانوں پر کہ جنہوں نے دین کو مسجدوں میں یا ہفتے کے دنوں میں (مثلاً جمعرات و پیر وغیرہ کے دن) یا بدعات وغیرہ میں باندھ کر رکھ دیا ہے، جبکہ ہمارے ہادی اور دین کامل کے رہنما حضرت محمد ﷺ نے تو زندگی کا کوئی گوشہ بھی نہیں چھوڑا جہاں دین پر قولاً یا عملاً عمل پیرا ہو کر نہ دکھایا ہو اور ایک انسان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی (پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام مراحل کو) نہیں چھوڑا جہاں پر دین کو سمو کر نہ دکھایا ہو۔ تہذیب الاطفال کے تمام مراحل بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان اپنی اور بچوں کی زندگی میں ان کی تربیت میں قرآن اور حدیث سے قدم قدم پر رہنمائی حاصل کریں---- تاکہ ہماری پوری کی پوری زندگی میں صحیح دین کا نمونہ پیش ہو اور "وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" والی صورت حال بن جائے۔

اسی ضمن میں اگلی حدیث بیان کرتی ہوں۔ عَنِ ابنِ عباسٍ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اَکْرِمُوا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوا اَدَبَھُم (ترغیب و ترہیب بحوالہ ابن ماجہ) ترجمہ "حضرت ابن عباسؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اولاد کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کرو اور ان کو اچھی تعلیم و تربیت دو"۔ ہمارے بچے جب بولنے کی عمر کو پہنچیں تو نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق

انہیں کلمہ طیبہ سکھایا جائے اور چھوٹی چھوٹی دعائیں وغیرہ یاد کروائی جائیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام سے آشنا ہوں۔ اچھے طریقے سے اور اچھی گفتگو سے ان کی تربیت کی جائے اور انہیں دین اسلام کے مطابق آداب زندگی سکھائے جائیں تا کہ ان کے ہر ہر قول اور فعل سے مسلمان بچے کی جھلک نظر آئے۔ انہیں روزمرہ کے معمولات کی چھوٹی چھوٹی دعائیں یاد کرائی جائیں' مثلاً سونے کی' جاگنے کی' کھانے سے پہلے اور بعد کی' دودھ پینے کی' بیت الخلاء میں جانے اور باہر آنے کی۔ ان کو شروع سے ہی جھوٹی کہانیوں کے بجائے صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کے واقعات' غزوات کے بارے میں معلومات اور اہل ایمان کی بہادری کے ایمان افروز واقعات سنا کر ان کے اندر ایک اعتماد کی فضا قائم کی جائے تا کہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کریں۔ انہیں نماز یاد کروانی شروع کی جائے اور خود بھی پابندی سے احسن طریقے سے نماز پڑھیں تا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا جذبہ بیدار ہو۔ اخلاقی طور پر ان کو سچ اور جھوٹ تمیز کروائی جائے۔ کسی وقت سچ بولنے پر ان کو انعام بھی دیں اور جھوٹ سے اس حد تک نفرت دلائیں کہ بچہ واقعی تھوڑے سے فائدے کی خاطر بھی جھوٹ کی طرف نہ آئے۔ ہلکی پھلکی چوری کرنے سے بھی پرہیز کروائیں۔ بچوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آئیں' لہجہ میں نرمی ہو۔ آپ بچوں کے حق میں رحم دل ہوں۔ ان کی چھوٹی موٹی جائز فرمائش بھی پوری کر دیں۔ ان سے مہذّبانہ گفتگو کریں تا کہ بچے بااخلاق اٹھیں۔

یہ عمر یعنی تین سال سے سات سال تک کی ایسی نازک ہوتی ہے کہ واقعتاً آپ جو کچھ بھی گھر میں شعوری اور لاشعوری طور پر کرتی ہیں اسے بچے ٹیپ کی طرح اپنے ذہنوں میں منتقل کرتے جاتے ہیں۔ ہم جب دوسری خواتین کے سامنے بات کرتی ہیں کہ ہم تو اپنے بچوں کو تمیز سکھا سکھا کر تھک گئے ہیں لیکن بچہ پھر بھی بدزبان ہے' جھوٹ بولتا ہے تو درحقیقت اس میں ہماری اپنی غلطی موجود ہوتی ہے۔ ہم خود بچے کے ساتھ گالی گلوچ بھی کرتے ہیں' جھوٹ بھی بول لیتے ہیں اور مبالغہ آرائی تو بہت زیادہ کرتے ہیں' چاہے وہ لاشعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بچہ دیانتداری سے یہ تمام چیزیں اپنے معصوم ذہن میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ درحقیقت اسلام نے اخلاقیات پر جس قدر زور دیا ہے شاید کسی اور

چیز پر نہ دیا ہو۔ اس ضمن میں چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخْلَاق" کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ قرآن حکیم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کے بارے میں الفاظ وارد ہوئے ہیں : "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" یعنی "آپ یقیناً اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں"۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا : "اَحْسَنُکُم اَحْسَنُکُم اَخلاقًا" یعنی "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے اچھا ہے"۔

سوچنے کی بات ہے کہ یہ تمام رہنمائی اور عمل کی یہ ساری باتیں کس کے لئے ہیں؟ یہی تو وہ اخلاقی اقدار ہیں کہ جن سے مسلمان کے اندر تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ قرآن کا انسانِ مطلوب بنتا ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی بچے کے خمیر میں یہ اوصاف ڈالے جائیں تو وہ جوان ہونے تک اللہ کے فضل و کرم سے ایسے تناور درخت کی مانند ہوتا ہے جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے سورۂ ابراہیم میں اس طرح دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَاءِ" ترجمہ : "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں"۔ بالکل یہی سمجھیں کہ بچے کی جڑ اسی عمر میں جمتی ہے۔ ایک مسلمان اور باخبر و باہوش ماں بچے کی اس عمر کو ضائع نہیں ہونے دیتی کہ ابھی تو بچہ ہے' اس کو ان چیزوں کا یا ان باتوں کا کیا پتہ۔ جس طرح ایک عام ماں کو بچے کی ظاہری حالت کی فکر رہتی ہے' جسمانی طور پر اسے توانا رکھنے کا فکر دامن گیر رہتا ہے کہ بچہ کوئی غلط چیز منہ میں نہ ڈال لے' خراب کھانا نہ کھالے' بالکل اسی طرح ایک نیک ماں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ میرا بچہ روحانی طور پر بھی صحیح معنوں میں توانا ہو' کوئی غلط بات منہ سے نہ نکالے' کوئی گالی گلوچ کی بات نہ کرے' ہر ایک سے اچھی طرح پیش آئے وغیرہ وغیرہ۔ اخلاقی طور پر اس طرح قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی جائے تو وہ بڑا ہو کہ واقعتاً علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہو گا۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری!

تصویر کا دوسرا رخ

میں آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہتی ہوں کہ ہونا تو کیا چاہئے' لیکن آجکل مسلمان خواتین بچوں کے حق میں کیا کر رہی ہیں۔ ذرا دیانتداری سے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ جدید تہذیب الاطفال کیا سکھا رہی ہے کہ جونہی بچہ بولنا شروع کرے تو اس کی زبان سے مسلمان والی کوئی بات نہ نکلے بلکہ اس کی جگہ ماما' پاپا' سوری' تھینک یو' گڈ مارننگ' بائے بائے' انگریزی پوئمز' فضول گانے اور تھرکنا' مٹکنا سکھانا شروع کیا جائے۔ جتنے بھی غیر اسلامی آداب ہیں وہ بچے کو ازبر کروائے جائیں۔ برا نہ مانیں' اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لیں۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ الاماشاء اللہ۔ اس لئے کہ "جدّت پسندی" کا تقاضا یہی ہے۔ "مہذّب" کہلانے کی صورت یہی رہ گئی ہے۔ انگریزوں سے ہم مرعوب ہیں' ہندوؤں کے رسم و رواج ہم بہت پسند کرتے ہیں' عیسائیت کی تعلیم ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ تو کیوں نہ ہم پورے کے پورے ہی ان کے رنگ میں رنگ جائیں (اَعاذنا اللّٰہُ مِن ذٰلک) اسی موقع کے لئے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

افسوس کا مقام ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا' خدا ہی ملا نہ وصال صنم' اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ گویا "مُذَبْذَبِینَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ"۔ اس اعتبار سے غیر مسلم ہم سے اچھے نکلے کہ بظاہر وہ چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں' انہوں نے اسلام کا بیج' مغز اور گودا یعنی اخلاق وغیرہ مستعار لے کر اپنے معاملات وغیرہ سنوار لئے اور نکھار لئے' لیکن ہم اجتماعی لحاظ سے نہ اخلاقی طور پر کچھ بن سکے اور نہ ہی اپنی ظاہری حالت سنوار سکے۔ بات ذرا تلخ ہو گئی ہے' معافی چاہتی ہوں' لیکن یہ حقائق ہیں۔ ہم مسلمان جنہیں قرآن نے "خیرِ امت" قرار دیا ہے' ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیں تو ہم پر عیاں ہو جائے گا کہ ہم جیسا بیج بوئیں گے' جس طرح اس کی آبیاری کریں گے' جیسی تہذیب سے بچوں کو روشناس کروائیں گے' لازماً "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کے مصداق اور "As you sow so shall you reap" کے مطابق ویسا ہی پھل

آپ کے سامنے پکتا جائے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم بچوں کو اسلامی باتیں اور اخلاقی اقدار اسی لئے نہیں سکھاتے کہ چونکہ سارا معاشرہ دوسرے رخ پر جارہا ہے تو اگر ہم نے انہیں دین کی باتیں سکھادیں' اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات پر عمل کرنا سکھادیا تو لوگ کیا کہیں گے کہ انہیں تو تمیز ہی نہیں' یہ نئی تہذیب سے آشنا ہی نہیں ہیں' بیک وارڈ ہیں' مولوی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یاد رکھیں' آپ کی اولاد آپ کے حق میں صدقہ جاریہ یا عذاب کی صورت اسی وجہ سے ہوگی کہ آپ نے ان کی نشوونما کس طریقے سے کی۔ اسلام کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ان کی تربیت کی تو فھوالمطلوب' لیکن اگر معاملہ ایسا ہی رہا کہ بیج کو صحیح خوراک نہیں دی بلکہ تربیت کے معاملہ میں کچھ انگریزی اور ہندوانہ کھاد ڈال دی' کچھ یہودیت کی آبیاری کردی اور کچھ عیسائیت کی dose دے دی' تو اپنی اصل کے برعکس ناقص اور گلا سڑا پھل لئے ہوئے "شجرۂ خبیثہ" آپ کے سامنے پروان چڑھتا نظر آئے گا اور آپ کی چہیتی اور لاڈلی اولاد سرکش' بدتمیز اور زبان دراز ہوگی' خود غرض اور نافرمان اٹھے گی اور آپ کے بڑھاپے میں آپ کو دور ہی سے سلام کرے گی جیسا کہ آجکل عام گھرانوں میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو آپ کے ساتھ یہ سلوک ہوگا ہی' لیکن اسی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ مرتے ہی جب ہم قبر میں جائیں گے تو بری اولاد کی وجہ سے عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے۔ زمین کی گود میں گناہ کے کام آپ کی اولاد مزے سے کر رہی ہوگی اور گور میں اس کی سزا آپ کو مل رہی ہوگی' کیونکہ اپنی اولاد کو گناہ کے کام اور غلط کاریاں آپ نے ہی سکھائی تھیں اور آپ ہی اپنی اولاد کی ذمہ دار تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ ماؤں ہی سے کرنی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ : "وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ" کہ عورت اپنے مرد کے گھر کی اور اس کی اولاد کی نگران ہے۔ لہٰذا اس اولاد کے ساتھ دین کے معاملے میں ولادت سے ہی دیانتداری اور خیر خواہی اور خلوص کا ثبوت دیں۔ "اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" کے الفاظ قرآنی میں اولاد آپ کے حق میں اسی لئے فتنہ اور آزمائش ہے کہ آپ اس کی تربیت دین کے اصولوں کے مطابق نہیں کر رہیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

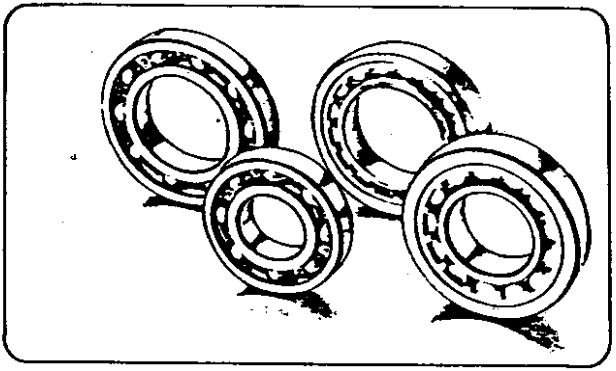

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

ایک خوش کن اطلاع

اعلیٰ کوالٹی کا چاول (نیا / پرانا) مارکیٹ سے رعایتی قیمت پر حاصل کریں۔ ہوم ڈیلیوری سروس کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ رابطہ کے لئے :

(1) محمد اقبال، اسلامیہ پارک، پونچھ روڈ لاہور، فون : 419193

(2) محمد عباس، رحمان پورہ، فون : 7583315-417772

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری **نجات** کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیۃ فی نسخۃ: ٦ روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ٣٣ فی صد کمیشن دیا جائے گا :

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. L 7360
Vol. 45 No. 8
August, 1996

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

کی تازہ ترین تالیف

برِعظیم پاک و ہند میں

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اور اس سے انحراف کی راہیں

جس میں

- اسلام کے ابتدائی انقلابی فکر اور اس میں زوال کی تاریخ کے جائزے کے بعد
- علامہ اقبال کے ذریعے اس کی تجدید اور مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے ہاتھوں اس کی تعمیل کی مساعی اور ان کے حاصل، اور
- "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں ناگزیر تدریج اور اس کے تقاضوں" کے علاوہ
- اس فکر سے انحراف کی بعض صورتوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے ——————!

سفید کاغذ پر ۱۰۴ صفحات، مع دیدہ زیب ہارڈ کور —— قیمت فی نسخہ -/۳۰